ریاست و حکومت کے اسلامی اصول

تحقیق و تالیف:

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

ریاست وحکومت

کے اسلامی اصول

تحقیق وتالیف:-

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

پورب اکادمی، اسلام آباد

طبع اوّل: جون 2010ء

ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر: 051 -2210 101 , 0301 - 559 58 61

ای میل: poorab_academy@yahoo.com

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

Riasat o Hakomat kay Islami Usool

by: Dr. Mustafeez Alvi

Published by: Poorab Academy, Islamabad, Pakistan

۲۹۷،۱

م س ت علوی، مستفیض احمد، ڈاکٹر

ریاست وحکومت کے اسلامی اصول/ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء

۱۸۴ص

۱. اسلام۔۔۔سیاسیات

انتساب

والد محترم اور والدہ محترمہ کے نام
جن کی تربیت نے دین متین کے ساتھ
شعوری وابستگی عطا کی
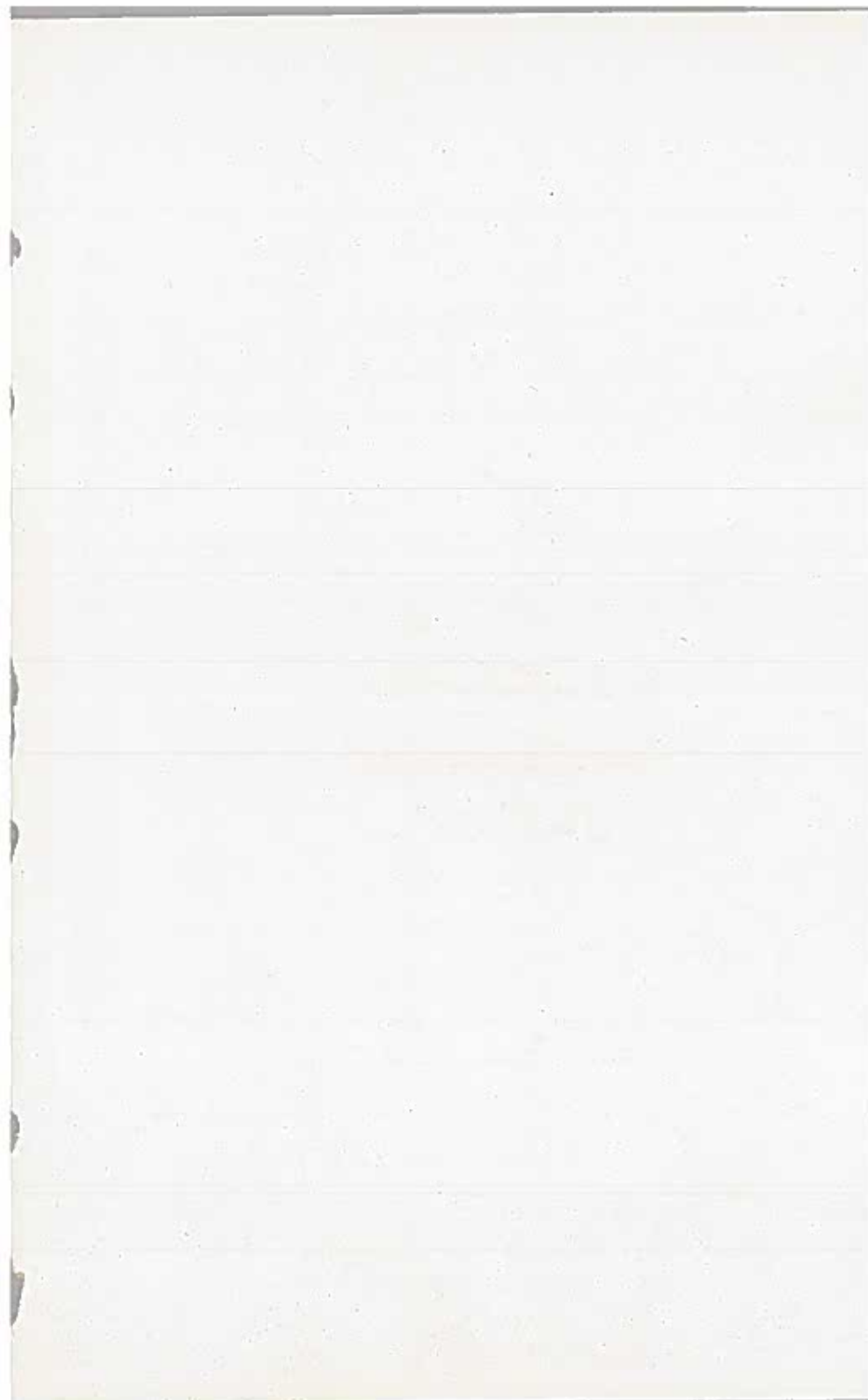
فہرست مضامین
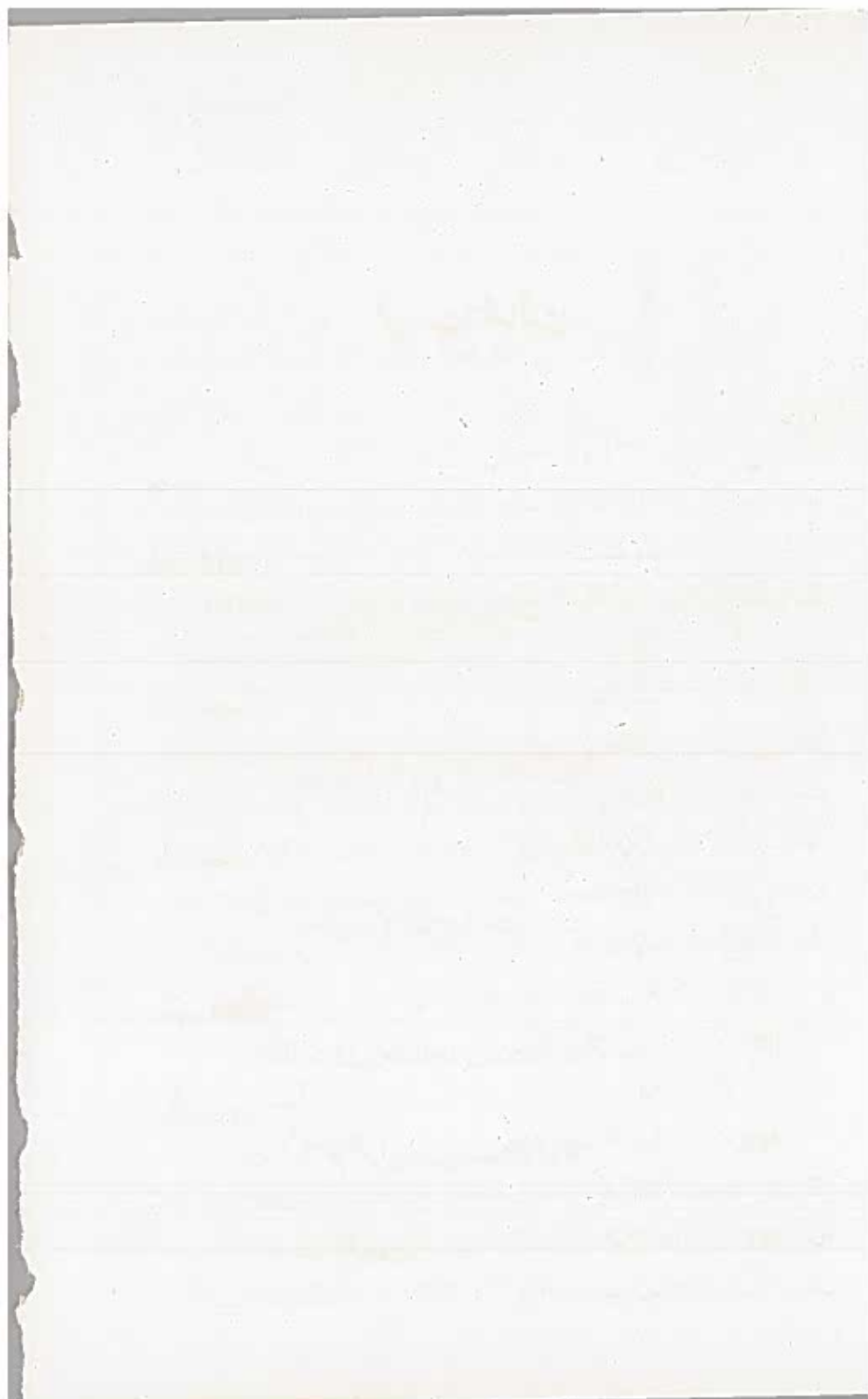
مقدمہ

تہذیب وتمدن کی ترقی کے تمام دعوؤں کے باوجود، یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ آج کی دنیا کی اکثر ریاستیں، سیاسی ومعاشرتی لحاظ سے عدم استحکام کا شکار ہیں۔ چند معاشروں میں حکومتی نظام کی مضبوطی اور وسائل کی فراہمی نے ایک مخصوص طبقے کے مفادات کا تحفظ کیا ہوا ہے، مگر اسکا قطعاً مطلب یہ نہیں کہ انسانی تمدن من حیث المجموع ترقی پذیر ہے۔ انسانی آبادی کا اکثر حصہ سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کا شکار ہے۔

کہیں نظریۂ انفرادیت کے پیروکار، سرمایہ دار معاشرے معرض وجود میں آچکے ہیں، اور سودی معیشت (Capitalism) کے ذریعے سرمایہ، چند افراد اور چند ریاستوں کے ہاتھوں میں منجمد کر دیا گیا ہے، جو کمزور قوموں کے استیصال کی بنیاد بن چکا ہے۔ اس نقطۂ نظر نے انفرادی سطح پر، خودغرضی کے عام رویئے کو پروان چڑھایا ہے جبکہ قومی سطح پر، اس طرز عمل نے مفاد پرستانہ استحصال (Interest oriented exploitation) کو طاقتور قوموں کا وطیرہ بنا دیا ہے۔۔۔ سرمایہ دارانہ معاشرے، ترقی یافتہ ممالک اور تیسری دنیا۔۔۔ میں بٹی ہوئی آج کی دنیا، اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔ کچھ ریاستوں کو نظریۂ اجتماعیت یا اشتراکیت (Socialism) نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا ہے تو بھی عملی مظاہر، کچھ کم بھیانک نہیں نکلے ہیں۔ ریاست کی مطلق العنانیت نے کارکنان تہذیب وتمدن کو بے بس اور بے حس کر کے رکھ دیا ہے، جس کی واضح شکل، اشتراکی ریاستوں اور انکے زیر اثر معاشروں میں نظر آ رہی ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ یہ مسئلہ آج کا نہیں، پوری تاریخ انسانی اسی سے عبارت ہے۔ افراد اور ریاستیں اپنے حقوق وفرائض، اختیارات وترجیحات اور وسائل و ذرائع کے استعمال کے اعتبار سے ہمیشہ افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں۔ اس مرض کی تشخیص میں

بھی کئی مغالطے در آتے رہے ہیں۔ کبھی یہ سمجھا گیا کہ انسان کا بنیادی مسئلہ معاشی ناہمواری ہے۔ علاج سوچا گیا مگر، سرمایہ دارانہ نظام سے لے کر کمیونزم تک، مختلف نظام ہائے معیشت اپنانے کے باوجود انسانی آبادی کا بہت بڑا حصہ بھوک کا شکار رہا۔ پھر یہ کہا گیا کہ اصل مسئلہ آزادی، بنیادی حقوق اور سماجی تحفظات ہیں اور اس کا حل ایک جدید سیاسی نظام اور جمہوری قانون کی صورت میں ممکن ہے۔ اسطرح بادشاہت کی جگہ، اشرافیہ سے لے کر جدید پارلیمانی نظام تک، آزمائے گئے مگر اس کے باوجود سماجی انارکی ختم نہ ہو سکی۔ قومی ریاست کا تجربہ کیا گیا تو قومیت پرستی کا جنون حشر سامانیاں لایا۔ پھر بین الاقوامی ریاست وحکومت کی خواہش پیدا ہوئی اور اقوام متحدہ وجود میں آئی، جسکے چارٹر آج بھی بے بسی کا رونا روتے نظر آرہے ہیں۔۔۔ گویا تشخیص درست ہوئی نہ علاج کارگر! سوچنے کیضرورت ہے کہ اس سب کچھ کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کے سارے اعضاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ کسی ایک میں خرابی اور بگاڑ سے سب متاثر ہوتے ہیں اور مکمل صحت کے لئے سب کا علاج کرنا پڑتا ہے۔ یہ اصول تسلیم نہ کرنے کی صورت میں، انسانی زندگی مختلف حصوں میں بٹ جاتی ہے اور اجتماعی فلاح کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ دراصل انسانی فلاح وکامرانی کا دارومدار، انسان کے اس تصور اور نظریے پر ہے جو وہ، اس کائنات میں اپنے مقام اور زندگی کے بارے میں قائم کرتا ہے، اور پھر اسے فلسفہ زندگی کے طور پر اپنا لیتا ہے۔

سولھویں صدی کی یورپی نشاۃ ثانیہ نے جہاں انسان کے بہت سے عقدے وا کیے ہیں وہیں کچھ نئے مسائل کو بھی جنم دیا ہے۔ خاص طور پر انسان کو، اپنے علم پہ انحصار اور ہدایت الٰہی سے بے نیازی کا جو سبق دیا گیا ہے اس سے زندگی نئے مصائب کا شکار ہو کے رہ گئی ہے۔ زندگی کے بنیادی سوالات۔۔۔ یعنی یہ کہ زندگی اور کائنات کی حقیقت اور مقصد کیا ہے؟ اخلاقی اور مادی وجود کے تقاضے اور دائرہ کار کیا ہے؟ انسان اور کائنات کا آپس میں اور خدا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ کائنات اور زندگی کا طبعی اور اخلاقی انجام کیا ہے؟۔۔۔ کے جوابات کے معاملہ میں انسان نے اپنے محدود ذرائع علم کے ذریعے، حکم لگانے کی کوشش کی ہے، اور بری طرح دھوکا کھایا ہے۔ حسی ذرائع کی بدولت حاصل ہونے والے اس علم کا نتیجہ یہ ہے کہ، انسان ایک سماجی حیوان ہے (ارسطو) جو صدیوں کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ایک اعلیٰ جانور بنا ہے (ڈارون) اس کی تمام

سرگرمی کا سب سے قوی محرک عمل، جنسی جبلت ہے (فرائیڈ)۔ مقصد حاصل ہونا اصل کامیابی ہے، ذرائع کے سلسلے میں، جائز و ناجائز کی بحث غیر ضروری ہے (میکن رمیکیاولی)۔

اس فکری کوتاہی اور نارسائی کیوجہ، الٰہی ہدایت سے بے نیازی اور حسی علم پر ضرورت سے زیادہ انحصار ہے۔ اب انسانی علم کا بنیادی ذریعہ عقل وحواس قرار پا گئے ہیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسانی عقل اپنے شعوری نتائج کے لیے، حواس کی فراہم کردہ معلومات کی محتاج ہے۔ حواس کے بارے میں انسانی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ اپنی رسائی اور کارکردگی کے لحاظ سے محدود ہیں۔ یہ مادی حقائق کا پتا دیتے ہیں جب کہ غیر مادی حقائق کا کردار انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے اور وہ حواس انسانی کی پہنچ سے باہر ہیں۔ گویا حواس کا استعمال بطور ذریعہ علم کے، کچھ خاص کاموں، جن کیلیے یہ مخصوص اور مختص ہیں، کے علاوہ کسی اور میدان میں بے کار ہے۔ یہ ناقابل اعتماد بھی ہیں کہ آسانی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ عارضی ہیں اور انکے ضائع ہونے کا احتمال ہر وقت رہتا ہے۔ یہ زمان و مکان کی حدوں میں مقید ہیں۔ لہذا ان کے ذریعے سے کسی اہم، پائیدار اور غلطیوں سے پاک فیصلے کی توقع کرنا بے سود ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس ذریعہ سے حاصل شدہ علم کی بنیاد پر جو تہذیب وتمدن استوار ہوتے ہیں، کچھ بنیادی کمزوریاں ان کا خاصہ ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ غیر حسی حقائق (خدا اور آخرت) کا انکار ۔۔۔ جس کی بنیاد پر انسان غیر ذمہ دار، خودغرضی کا پتلا اور ذاتی مفادات کا پجاری بن جاتا ہے۔ حاضر کو غائب پر ترجیح دے کر خواہشات کا غلام بنتا چلا جاتا ہے۔ اور یوں وہ کبھی حرص و ہوس میں گرفتار ہو کر سماج دشمن بن جاتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو مجبور محض جان کر، تہذیب وتمدن کے بنیادی مسائل سے فرار ہی کو، صحیح اور مفید طرز عمل سمجھنے لگ جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر یہ بات آج واضح ہو چکی ہے کہ انسان نے مذکورہ بالا بنیادی سوالات کے جوابات تلاش کرنے میں غلطی کی ہے اور اس بنیادی کمزوری نے، اسے کائنات میں اپنا مقام متعین کرنے اور قابل عمل، سیدھا اور درست نظام حیات (صراط مستقیم) حاصل کرنے میں ناکام رکھا ہے، جو کہ اسکی بنیادی ضرورت تھا۔

اس صراط مستقیم کی طرف مستند اور قابل عمل راہنمائی انسان کو خالق کائنات کے عطا

کردہ علم وحی سے ہی میسر آسکتی ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جو صرف صحیح اور غلط کی تمیز ہی عطا نہیں کرتی بلکہ اس یقین وایمان سے بھی انسان کو مالا مال کرتی ہے، جو کسی بھی عمل کے لیے بنیادی محرک ہوا کرتا ہے۔۔ یہ عالم غیب کی وہ آواز ہے جس کے ذریعے انسان کو ان حقائق کا حقیقی علم عطا ہوتا ہے جن کے بارے اسکے اپنے ذرائع علم، بے بس ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک سادہ اور قابل عمل نظریہ حیات ہے جو زندگی کے فکری وعملی، دونوں پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس علم وعمل کا مبنی برصداقت ہونا اور ہر ایک کیلیے مفید ہونا، انسانی تجربے سے ثابت ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق، انسانی عقل وشعور نے کی ہے اور اس کے وجدان وضمیر نے بھی!

لہٰذا جب تک انسانی اجتماعیت اپنے خالق کے دیئے ہوئے نظام سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کر لیتی، اس کے دکھ ختم نہیں ہو سکتے۔ تاریخ انسانی میں قدیم قوموں کی تباہی کا سبب بھی، انسان کی یہی غفلت، لاپرواہی اور بے نیازی بنی تھی، اور آج بھی معاشرتی ہولناکیوں کی وجہ، انسان کی اپنے رب رحمٰن کے ضابطۂ حیات سے بغاوت ہی بنی ہوئی ہے۔ آئے دن اس کے خطرناک حادثات سے انسان دوچار ہوتا رہتا ہے۔

تاریخ انسانی کے آثار قدیمہ کی بنیاد پر، سماجیات کے ماہرین کی طرف سے، مذہب کو ریاست کی ابتداء اور اس کے ارتقاء میں بنیادی کردار کا حامل مانا گیا ہے۔ مذہب نے انسان کو نہ صرف زندگی کا شعور دیا بلکہ اسے مقصد حیات کیساتھ ہم آہنگ اور یکسو کیا۔ اسے اپنے مقام اور خالق ومالک سے روشناس کروایا۔ ایک اکائی کے طور پر پروان چڑھنے کا سلیقہ سکھایا اور آپس میں مربوط کر کے اجتماعیت اور یکجہتی سے مالا مال کیا۔ افراد اور معاشروں کو الہامی کتابوں اور مقدس نبیوں نے، بنیادی اوصاف انسانی اور اعلیٰ اخلاقیات سے مزین کیا۔ اس کی فطرت کو پاکیزہ اور رویوں کو متوازن کر کے اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کیا۔

مذہب نے جہاں فرد کی اصلاح کے ذریعے معاشروں کو تبدیل کیا وہاں ریاست کو ضابطۂ حکومت عطا کر کے، اسے معاشرے کی اصلاح اور فلاح کا ذریعہ بنایا۔ انبیائے کرام کے قائم کردہ اس تہذیب وتمدن کی ابتداء پہلے انسان، آدم سے ہوئی اور اسکی کامل واکمل صورت، خدائے عزوجل نے اپنے برگزیدہ، آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے عطا کی۔

نبی آخر الزمان ﷺ نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں، حجاز کی سرزمین سے اس

روشنی کو پوری دنیا کے لئے پھیلانا شروع کیا اور مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کر دی، جو آپ کی دس سال کی کاوش کے ذریعے، تقریباً ۱۵ لاکھ مربع کلو میٹر کی وسعت اختیار کر گئی۔ آنحضورﷺ کی رحلت کے بعد آپ کی براہ راست تربیت سے تیار شدہ افراد نے حضورﷺ کے اختیار کردہ طریق کار کے مطابق، خلافت راشدہ کی صورت میں، اسلامی ریاست کا نظم ونسق، جاری وساری رکھا۔ خلافت راشدہ (۶۳۲ـ۶۶۰ء) کے تیس سال نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ تاریخ عالم میں ایک سنہری دور کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اس تہذیب انسانی کی بنیاد، خالق و مالک کائنات کے عطا کردہ اصول تھے اور جزئیات و فروعات، انسانی بصیرت کے تحت، وقت کے تقاضوں کیمطابق طے پاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اسلامی فلاحی ریاست، بعد میں صدیوں پر محیط نظام تمدن کی بنیاد بنی۔

ہم نے اس کتاب میں اسلامی ریاست کے اس عہد زریں کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے جسکی بنیادیں خود نبی آخر الزماںﷺ نے رکھی تھیں۔ پہلا حصہ، کچھ اصولی مباحث پر مبنی ہے اور دوسرا، اس ریاست سے متعلق، زمینی حقائق کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں جدید سیاسی فلسفے کا محاکمہ، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں، قرآن کی روشنی میں، اسلامی تصور ریاست وخلافت کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ بنیادی نظریاتی خدوخال واضح ہوں۔ اسکے بعد، رسول اللہﷺ کے عہد میں موجود اہم ریاستوں کے سیاسی خدوخال کا، طائرانہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے، تاکہ وہ منظرنامہ سامنے ہو جس میں اللہ کے نبی نے اسلامی ریاست کے قیام کا منفرد تجربہ کیا اور دنیا کے سامنے مختصر سے عرصہ میں ایک مثالی ریاست ومعاشرہ تخلیق کر کے دکھا دیا۔

اس پس منظر کیساتھ، تیسرے باب میں، انتظام ریاست کا نبوی طریق، تاریخی حقائق کی روشنی میں، تفصیلی مطالعہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ رسول اللہﷺ کی قائم کردہ ریاست اور معاشرہ کو انکے خلفاء نے کس طرح سنبھالا اور ارتقاء کی جانب سفر کیا، یہ تفصیل، چوتھے باب میں آئی ہے۔ جہاں، خلافت راشدہ کے ان کارہائے نمایاں کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جو معاشرتی وسماجی حوالوں سے مسلمانوں کے سیاسی دور عروج میں، پوری تاریخ انسانی کا ایک مثالی اور سنہری حصہ بن گئے۔

پانچویں باب میں ان مسلم مفکرین کے افکار کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جنہوں نے اسلامی اصول سیاست کی روشنی میں، ریاست کے فلاحی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا تھا۔ اس مطالعے کے ذریعے، مستقبل کی کسی بھی مثالی ریاست وحکومت کیلیے ایک واضح لائحہ عمل سامنے آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو شرف قبولیت بخشیں اور اسکے ذریعے ایسے مزید بہتر مطالعے کی راہ ہموار ہو۔

و ماتوفیقی ا الّابالّٰله العلیّ العظیم ہ

باب اوّل

ریاست اور خلافت کا قرآنی تصوّر

قرآن اور ریاست

ریاست کا لفظ اردو زبان میں عربی سے آیا ہے۔ یہ لفظ 'راس' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں سر یا چوٹی۔ اسی بنیاد پر ریاست سے مراد انسانی معاشرے کی تنظیم اور سربراہی ہے۔ ریاست، انگریزی زبان کے لفظ STATE کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سٹیٹ کا لفظ انگریزی زبان میں لاطینی سے آیا، جسکے معنی قیام یا مقام کے تھے۔ قدیم جاگیردارانہ نظام میں ایسے خطہء زمین یا مخصوص علاقے کو اسٹیٹ کہتے تھے جو ایک طاقتور زمیندار یا سردار کی ملکیت ہوتا تھا جسکی بنیاد پر وہ عوام پر اپنی حاکمیت قائم رکھتا تھا۔ جدید دور میں ریاست، انسانوں کی ایک منظم اجتماعیت کا نام ہے، یعنی کسی خاص علاقہ میں موجود، انسانوں کا ایک ایسا معاشرہ جو اپنی حکومت رکھتا ہو اور جس پر دستور و قانون کی حکمرانی قائم ہو، ریاست کہلاتا ہے۔

ریاست کا ادارہ دراصل انسانی اجتماعیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم انسان دریاؤں کے کنارے اپنی بستیاں آباد کرتا تھا۔ ضروریات زندگی اور آپس کے تعلقات کے نتیجے میں انسانی آبادیاں، آہستہ آہستہ منظم معاشروں کی شکل اختیار کر گئیں۔ مل جل کر رہنا انسان کی فطرت اور ضرورت ہے۔ ہر کام، ہر آدمی نہیں کرسکتا۔ کوئی گندم بیجتا ہے تو کوئی اناج سے آٹا بناتا ہے جس سے روٹی بنتی ہے جو سب کھاتے ہیں۔ کوئی کپاس اگاتا ہے تو کوئی کپڑے بنتا ہے تاکہ دوسرے اسکو پہن سکیں۔ یوں مل جل کر رہنے سے، انسان ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ انسانی معاشروں کی تنظیم میں، ضروریات زندگی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی بنیاد پر مختلف پیشے وجود میں آئے۔ باہمی تعاون کے طریقے اور اصول بنائے گئے۔ ان

اصولوں کو لاگو کرنے کے لئے حکومت کا طریقہ وجود میں آیا۔ انسانی معاشرے کی اس ترقی کے ہر موڑ پر مذہب نے، ہدایت انسانی کا بنیادی فریضہ انجام دیا اور یوں انسانی آبادیاں منظم ریاستوں میں تبدیل ہو گئیں۔

قرآن مجید میں انسانی معاشرے کے آغاز، اس کی ابتدائی تنظیم اور انسانی تاریخ کے اہم سنگ ہائے میل کے بارے میں کئی مقامات پر، بہت اہم تبصرے کیے گئے ہیں۔ اپنے نزول کے اعتبار سے قرآن سب سے آخری اور جدید کتاب ہے۔ جس طرح اس کتاب کی حفاظت کی گئی ہے۔۔۔ زبانی یاد کرنے کیصورت میں اور اپنی اصل زبان میں لکھنے کی شکل میں۔۔۔ کسی اور الہامی کتاب کو اسطرح محفوظ نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت موجود ہے کہ:

انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون ٥ (الحجر: ۹)

(یقینی بات ہے کہ اس ذکر کو ہم ہی نے نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

اس پہلو سے دیکھا جائے تو، انسانی تاریخ کے قدیم دور کے بارے میں، دنیا میں اسوقت ،قرآن سے بڑھ کر کوئی اور معتبر حوالہ موجود نہیں ہے اور تاریخ کے اہم اصولوں کی نشاندہی، قرآن کا دعویٰ بھی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لقد انزلنآ الیکم کتٰباً فیه ذکرکم افلا تعقلون ٥ (الانبیاء: ۱۰)

(تاکید ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)

خصوصاً قوموں کے عروج وزوال کی داستان، انسانی معاشروں کے عمومی رویّے، اور اس سلسلہ میں اللہ کی سنّت کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس حوالے سے کتاب الٰہی کا اسلوب، کسی بھی سلیم الفطرت انسان کے لیے سبق آموز اصولوں سے مزین ہے۔ ایک طرف تو اللہ کے منتخب کردہ مقدّس انبیاء کی سیرۃ و سوانح بیان ہوئی ہیں اور دوسری طرف اہم قدیم انسانی قوموں کے اجتماعی کردار و رویّے کی تفصیل سامنے آتی ہے:

لا رطب ولا یابس الّافی کتٰب مبین ٥ (الانعام: ۵۹)

(خشکی وتری سے متعلق کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کھلی کتاب میں نہ ہو)

قرآن مجید میں، ماضی کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ نہ صرف معاشروں کے زوال

کے اسباب سامنے آتے ہیں بلکہ مستقبل میں انسانی عروج کے سنہرے اصول بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے دامن میں کوئی اور ایسی منفرد 'کتاب' یقیناً موجود نہیں ہے۔ رسول خدا ﷺ سے زیادہ معتبر، اس سلسلے میں اور کس کی بات ہو سکتی ہے کہ:

نزل القرآن علیٰ خمسة اوجه، حلال و حرام و محکم و متشابه و امثال۔ (مشکوٰۃ)

یعنی قرآن پانچ حقائق کیساتھ نازل ہوا؛ حلال وحرام، محکم ومتشابہ اور قوموں کی عبرت آموز داستانیں۔

انسانی زندگی اور معاشرے کے آغاز وارتقاء سے متعلق، اس کتاب ہدایت نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے:

۱۔ کائنات کو تخلیق کرنے اور زمین کو انسانی زندگی کے لیے موزوں بنانے کے بعد، پہلے انسان اور پہلے نبی، آدم علیہ السلام کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب بنایا گیا۔ شعور وفہم اور علم وعقل سے نواز کر دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپ کر بھیجا گیا۔ ابن آدم کو، اللہ نے زندگی کی نعمت کیساتھ ارادہ واختیار کی طاقت بخشی۔ صحیح وغلط کی تمیز بھی عطا کی، اور صحیح کیطرف راہنمائی بھی کی۔ اسے دنیا میں اختیارات دے کر امین بنایا اور مہلت عمل بھی عطا کی۔ اسی میں اس کی آزمائش رکھ دی گئی ہے کہ وہ حسن عمل کر کے انعام پاتا ہے یا بداعمالیاں کر کے سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

۲۔ پہلے آدم وحوا کا مسکن جنت تھا بعد میں انہیں زمین پر تہذیب وتمدن کے آغاز وارتقا کے لیے بھیج دیا گیا:

وقلنا اهبطوا منها جميعاً فامّا ياتينكم منّى هدىً فمن تبع هداى فلاخوف عليهم ولا هم يحزنون ٥ (البقرة:۳۸)

(اور ہم نے کہا کہ یہاں (جنت) سے نیچے اتر جاؤ (اور یاد رکھو) جب میری طرف سے تمہاری طرف ہدایت (نبی اور کتاب) آئے تو جو کوئی اس کی پیروی کرے گا اس کو کسی قسم کا رنج اور خوف نہیں ہوگا۔)

۳۔ انسانی تہذیب کا آغاز ایک خاندان سے ہوا، پھر قبیلے اور قومیں بنائی گئیں۔ یوں تمدن

وسعت پذیر ہوتا گیا:

یا یّھا النّاس انّا خلقنکم من ذکر وّ انثیٰ وجعلنکم شعوباً وّ قبائل لتعارفوا۔۔۔۔الآخر (الحجرات: ۱۳)

(اے بنی آدم! ہم نے تمہیں ایک (جوڑے) مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہارے قبیلے اور برادریاں بنادیں تاکہ تمہیں ایک دوسرے کی شناخت رہے۔)

۴۔شروع میں بنی نوع انسان ایک ہی نظریہ حیات پر کاربند تھے، پھر انکے رہن سہن میں تبدیلیاں آتی گئیں اور دوسری طرف ان کے نظریات زندگی میں اختلاف رونما ہوتے گئے۔خالق کائنات کیطرف سے،انسانیت کی اصلاح کے لیے، ہر دور میں پیغمبر مبعوث ہوتے رہے، جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات، کتابوں کی شکل میں نازل کیں تاکہ انسانیت سیدھے راستے پر چلتی رہے:

کان الناس امّۃ وّاحدۃ فبعث اللّٰہ النبیّین مبشّرین و منذرین و انزل معھم الکتٰب بالحقّ لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ۔۔۔۔ الآخر(البقرہ: ۲۱۳)

(انسان (شروع) میں ایک ہی امت تھے،اور اللہ نے اپنے پیغمبر بھیجے جو (اہل ایمان کے لئے) خوش خبریاں لائے اور (انکار کرنے والوں کے لئے) برے انجام کی خبریں ۔پھر اس نے حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ فیصلہ ہوسکے ان معاملات میں جن میں انسان اختلاف کرتے تھے۔)

۵۔ ہر قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی بھیجے جو انہیں ہدایت و راہنمائی سے سرفراز کرتے رہے، کچھ لوگوں نے ہدایت کو قبول کیا اور رحمت الٰہی کے حقدار ہوئے تو کچھ نے انکار کر کے اپنے مقدر میں گمراہی لکھ لی۔ انسانوں کی ایسی قومیں ماضی کا قصہ اور عبرت کا نشان بن کے رہ گئیں:

ولقد بعثنا فی کلّ امۃ رّسولً ان اعبدوا اللّٰہ واجتنبوا الطاغوت فمنھم من ھدی اللّٰہ ومنھم من حقّت علیہ الضللۃ ؕفسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذّبین ۝ (النحل: ٣٦)

قرآن کریم نے قدیم قوموں کا ذکر ان کی نمایاں خصوصیات، نبی کے ساتھ انکے رویے اور دنیا میں ان کے کردار کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً قوم نوح جو تین ہزار سال قبل مسیح میں دجلہ وفرات کی وادی کے زیریں حصے میں آباد تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قوم عاد جو جنوبی عرب، اومان، حضرموت یمن وغیرہ کے علاقے میں آباد رہی، ان کے لئے اللہ کے نبی حضرت ھود علیہ السلام تھے۔ قوم ثمود جس کا وطن شمال مغربی عرب تھا اور حضرت صالح علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے۔ قوم لوط جو عراق و فلسطین کے درمیان آباد تھی اور حضرت لوط علیہ السلام ان کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے، قوم مدین جن کا علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے درمیان تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث کیا گیا اور اسی طرح مصر کے باسی قبطی قبائل جن کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے اور پھر قوم بنی اسرائیل جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک، کئی انبیاء مبعوث ہوئے۔

انسانی معاشروں کے اس سارے تذکرے میں، قرآن مجید کا بنیادی موضوع، قوموں کے عروج وزوال اور ہدایت وگمراہی کے مختلف پہلو رہے ہیں۔ اس کتاب ہدایت نے بتایا ہے کہ انسانی معاشروں کی ترقی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایسی اعلیٰ صفات، رب کائنات پر ایمان اور اس کی اطاعت کے نتیجے میں انسان میں پیدا ہوتی ہیں۔

دور جدید کی ریاست اور اسکے اجزا کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے آج کی ریاست کے بنیادی عناصر یعنی خطہء زمین، آبادی یا قوم، حکومت اور اقتدار اعلیٰ۔۔۔ سب کا ذکر، کسی نا کسی طور کیا ہے، مگر اس سلسلہ میں کوئی لگا بندھا ڈھانچہ (ماڈل) طے نہیں کیا بلکہ اسے انسانی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ سماجی ضرورت کی بنیاد پر انسان کا اجتماعی شعور، ریاست وحکومت کا جو نقشہ موزوں سمجھے، اختیار کرلے۔

تاہم ایک بات بڑی واضح ہے کہ ریاست وحکومت کے وہ بنیادی اصول جو کسی خوشحال ،خوشگوار اور کامیاب ومفید، تہذیب وتمدن کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے وہ اصول وضوابط تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ معاشرہ کیسے ترتیب دیا جانا چاہیئے؟ اقتدار کا اصل مالک کون ہوگا؟ ریاست وحکومت کے مقاصد واہداف کیا ہوں؟ اور کن اصولوں پر انسانی زندگی کا اجتماعی نظام مستحکم کیا جائے؟ ان سب سوالوں کا جواب بطریق احسن دے دیا گیا ہے۔

(ہم ذیل میں صرف، ان اصولوں کو اختصار کے ساتھ بیان کرر ہے ہیں جو خالق کائنات نے اشرف المخلوقات کی اجتماعی زندگی کی بہتری اور ریاستی نظام کی بنیاد کے لئے عطا کیے ہیں):

۱۔ اقتدار اعلیٰ کا اصل مالک خالق کائنات ہے، کوئی انسانی ادارہ، کوئی طاقتور حاکم یا انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا مالک نہیں ٹھہر سکتا:

ان الحکم الّا للّٰہ ط امر الّا تعبدوا الّا ایّاہ ط ذالک الدین القیّم ولکنّ اکثر النّاس لا یعلمون o(یوسف: ۴۰)

(فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی سیدھا طریق زندگی ہے۔ جبکہ اکثر لوگ اس حقیقت کا ادراک نہیں کرر ہے۔)

۲۔ انسانوں کو ریاست وحکومت کا اقتدار کچھ عرصہ کے لئے بطور امانت دیا گیا ہے یا دیا جاتا ہے۔ یہ قوت اقتدار ایک فرد کے ہاتھ میں ہو یا کسی انسانی گروہ کے ایوان کے ہاتھ میں، بہر حال اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اسی کے سامنے اس کی جوابدہی ہونا ہے:

وھو الذی جعلکم خلٰئف الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجٰت لّیبلوکم فی مآ اٰتکم ط..... (الانعام: ۱۶۵)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیئے تا کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔)

۳۔ دستور وآئین کا بنیادی مآخذ کتاب الٰہی ہے جس میں بنیادی اصول بیان کر دیئے گئے ہیں، انسان کو چاہئے کہ ان اصولوں کو اپنے حالات کے مطابق بنیاد بنا کر اپنے لئے نظام وضع کرے:

ان الحکم الّا للّٰہ ط یقصّ الحق وھو خیر الفاصلین o(الانعام: ۵۷)

(فیصلہ کا سارا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے)

۴۔ اس سلسلہ میں عوام الناس کی اکثریت کو ہر فیصلے اختیار دینا دنیا اور آخرت کے حوالوں سے مفید نہیں ہوگا:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلّوک عن سبیل اللّٰہ ط ان یّتبعون الّا الظّنّ وان هم الّا یخرصون ہ (الانعام:۵۷، ۱۱۶)

(اور اے محمد ﷺ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔)

افغیر ابتغی حکماً وّ هو الّذی انزل الیکم الکتٰب مفصّلا ط والّذین اٰتینٰهم الکتٰب یعلمون انّه منزّل مّن رّبّک با لحقّ فلا تکوننّ من الممترین ہ وتمّت کلمٰت ربّک صدقاً وّ عدلاً ط لا مبدّل لکلمٰته و هو السمیع العلیم ہ (الانعام: ۱۱۴۔۱۱۵)

(تو کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے، اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے، لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔)

۵۔ قرآن پاک نے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت نبی کی اطاعت ضروری ہے اور رسول کریم ﷺ آخری نبی ہونے کے سبب مکمل طور پر اطاعت اور فرمانبرداری کے مستحق ہیں۔ لہٰذا قرآن بطور دستور حیات اور رسول بطور مثالی نمونہ عمل، واجب الاطاعت ہیں اور رسول ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے:

فلا و ربّک لا یومنون حتّٰی یحکّموک شجر بینهم ثمّ لیجدوا فی انفسهم حرجاً مّمّا قضیت ویسلّم تسلیماً ہ (النساء: ۶۴، ۶۵، ۶۹، ۸۰)

(نہیں، اے محمد ﷺ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس

پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔)

۶۔ ریاست میں اجتماعی معاملات باہمی مشاورت سے چلائے جائیں گے جو بھی بہتر صورت ہو وہ اختیار کر لی جائے۔ تاہم عدل و انصاف کے ساتھ سماجی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی حکمت عملی ترتیب دی جائے گی، جس میں ہر فرد آزادرہ کر بھائی چارے اور اخوت کی فضاء میں ایک منصفانہ رویہ اپنائے۔ ایک جماعت تم میں ایسی رہنی چاہئے جو معاشرے کو اچھائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکتی رہے تاکہ معاشرے میں بھلائی کی نشوونما ہو:

والّذین یجتنبون کبٰر الاثم والفواحش واذاما غضبوا ھم یغفرون ہ والّذین استجابوا لربّھم واقاموا الصلٰوۃ وامرھم شورٰی بینھم وممّا رزقنھم ینفقون ہ (الشوریٰ: ۳۷،۳۸)

(اور وہ لوگ (قابل قدر ہیں) جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔)

۷۔ حکومت اور معاشرے کے درمیان اطاعت وفرمانبرداری کا تعلق ہوگا لیکن اس کی ترتیب یہ ہوگی کہ خالق کی اطاعت اور اس کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور تیسرے درجے میں اجتماعی معاملات کے ذمہ داران 'اولی الامر' کی اطاعت..... جن کا انتخاب باہمی مشورے سے مندرجہ بالا مقاصد کے تحت ہوگا اور بصورت ناکامی ان کو منصب سے علیحدہ کیا جاسکے گا:

انّ اللّٰہ یامرکم ان تئودوا الامنٰت الیٰ اھلھا واذا حکمتم بین النّاس ان تحکموا بالعدل ط........ الآیہ

(مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔۔۔)

یاأیّھا الّذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان

تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول....الآیہ (النساء: ۵۸، ۵۹)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول (ﷺ) کی پھیر دو۔۔۔۔)

یہ ہے مختصر خاکہ اس ریاست کا جس کا تصور قرآن مجید سے ہمیں ملتا ہے۔ گویا کہ یہ ایک ذمہ دار افراد کا منظم معاشرہ ہے جو اپنا حقیقی مقتدر اعلیٰ خالق کائنات کو مانتے ہوئے اس کے عطاء کردہ اختیارات حکومت اپنے میں سے اہل تر افراد کو سونپتے ہیں اور باہمی مشاورت سے اپنے معاملات میں بہتری کی مثبت کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہو کر، ایک خوشگوار ماحول اور خوشحال معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، جس میں انصاف کا بول بالا ہوتا ہے اور لوگ اپنے رب کی اطاعت کے لئے سازگار ماحول پاتے ہیں۔ ٹھیک یہی ہے وہ اصل مقصد جسکے لیے اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کو مبعوث کرتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم النّاس بالقسط.....الآیہ (الحدید: ۲۵)

(تا کید ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔۔۔۔۔)

نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی قرآنی اصولوں کی روشنی میں مدینہ میں پہلی مثالی ریاست تشکیل دی جو رہتی دنیا تک کے لیے مثال بنی، آئندہ صفحات میں اسی ریاست مدینہ کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

خلافت کی حقیقت

قرآن مجید میں تخلیق آدم کا بیان تفصیل سے آیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیات میں دربار خداوندی کی اس ملکوتی محفل کا تذکرہ ہے جس میں رب کائنات نے فرشتوں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ فرمایا کہ وہ زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہے۔ ارشاد ہوا:

....اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً.....الآیہ (۱)

سیاق وسباق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعلان دراصل ایک طرف، بعثت آدم کا پس منظر بیان کرتا ہے اور دوسری طرف، دنیائے ارضی میں انسان کی حیثیت اور اس کے مقام کا تعین بھی کرتا ہے۔اس بنیاد پر یہ آیۂ کریمہ، آیتِ خلافت قرار پاتی ہے۔لہٰذا قرآن پاک کی اس آیت کا بنظرِ عمیق مطالعہ ضروری ہے تا کہ تصورِ خلافت واضح ہو سکے۔پہلے ہم اس آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں:

ابن جریر الطبری کے بقول "انی جاعل" سے مراد" انی فاعل یا انی خالق" ہے کیونکہ قرآن میں جعل ، خلق کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔امام راغب اصفہانی نے جعل کے معانی...... بنانا، ایجاد کرنا، پیدا کرنا اور حکم لگانا لکھے ہیں۔(۲)

سیاق وسباق کو سامنے رکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں آدمؑ کو پیدا کرنے اور انہیں خلیفہ بنانے کا حکم صادر فرمایا ہے۔گویا انی جاعلٌ سے مراد تخلیق وبعثت آدم ہے جیسا کہ بعد کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا اہم لفظ' الأرض' ہے۔تحقیقی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لفظ قرآن مجید میں دو طرح سے استعمال ہوا ہے۔بعض مقامات پر تو کسی خاص علاقۂ زمین یا ریاست کے لئے...... مثلاً سلطنت روم کے تذکرے میں بطور علاقہ زمین کے، یہ لفظ یوں آیا ہے:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ٥ فِيْٓ أَدْنَى الْأَرْضِ...... الآیۃ

اسی طرح سرداران قوم کی طرف سے فرعون کو، حضرت موسیٰؑ کے خلاف تنبیہ میں، یہی لفظ، ریاست کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

يُرِيْدُ أَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ أَرْضِكُمْ ج...... الآیہ

لیکن قرآن مجید میں اکثر مقامات پر اس لفظ کا بالعموم استعمال، پورے خطۂ زمین کے لئے ہوا ہے۔یہ حقیقت ہر اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے جس میں زمین کا ذکر آسمانوں کے ساتھ ساتھ موجود ہے، مثلاً:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ...... الآیہ (۳)

امام راغب کے مطابق ''ارض'' کے معنی جـــرم (سیارہ رقطعہ رخطہ) کے ہیں جو ''ســـمـــا'' (آسمان) کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد کسی چیز کا نچلا حصہ بھی ہوتا ہے۔(۴)

کچھ مفسرین، اول الذکر مفہوم کی روشنی میں آیت خلافت کے ضمن میں 'الارض' سے مراد صرف مکہ کی سرزمین لیتے ہیں۔ لیکن اکثر کے ہاں، یہاں پورا خطۂ زمین ہی مراد ہے، جیسا کہ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے۔(۵)

یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہاں مکہ کی سرزمین اور پورا خطہ زمین، دونوں، بیک وقت مراد ہوں۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ قرآن نے انسانی تہذیب وتمدن کا ماخذ مکہ کی بستی کو ہی قرار دیا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ مکہ کو ''ام القریٰ'' (بستیوں کی ماں یعنی تہذیب وتمدن کی بنیاد) کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اور دوسرے یوں کہ انسانوں کے لئے قائم ہونے والے پہلے خانہ خدا کا مرکز بھی اسی شہر کو قرار دیا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہ

اور یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر، زمین پر آنے والے سب سے پہلے انسان، حضرت آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی۔ اسی لئے قرآن مجید نے خانہ کعبہ کو ''بیت العتیق'' بھی کہا ہے۔(۶)

ہبوط آدم یعنی انسان کے زمین پر نزول کے حوالے سے قرآن مجید کہتا ہے:

وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج وَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ہ

یہ ہبوط آدم دنیا میں کہاں ہوا تھا؟ قرآن اس باب میں خاموش ہے اور تفسیروں میں جو روایتیں منقول ہیں ان میں سے کوئی حدیث صحیح کے درجے کی نہیں، بلکہ سب کا ماخذ اسرائیلیات ہی ہیں۔(۷)

تاہم درج بالا قرآنی دلائل کی روشنی میں قرین قیاس ہے کہ انسانی تمدن کا آغاز سرزمین مکہ ہی سے ہوا۔ لہٰذا ان حقائق کی زمانوی ترتیب اور باہم تطبیق سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل بات نہیں کہ مذکورہ بالا حوالوں میں 'الارض' سے مراد خانہ کعبہ کی سرزمین مکہ اور اس مقدس خطہ کی

امین، پوری سطح زمین ہے اور یہاں یہ لفظ خاص اور عام، دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
بعدازیں، ہم آیت خلافت کے لفظ 'خلیفہ' کا تحقیقی مطالعہ کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں سب سے مقدم سوال اس کے لغوی معنی کا ہے؟......اسی سے خلافت کا مفہوم سامنے آسکے گا۔

لغوی تحقیق

اہل لغت نے خلافت کا مادہ خلف بتایا ہے جو کہ ان کے بقول قدام کی ضد ہے۔ یہ قرآن مجید میں خَلْفٌ اور خَلَفَ کی صورت میں آیا ہے۔خلف کے معنی بعد میں آنے اور جانشین ہونے کے ہیں اور اسی سے خلافة بمعنی نیابت وجانشینی کے آتا ہے۔

ابن منظور افریقی، لفظ خلافت کے بارے لکھتے ہیں:

و هي تكون اسماً و ظرفاً، (فاذا كانت اسما جرت بوجوه الاعراب، و اذا كانت ظرفا لم تزل نصبا على حالها) .... و قوله : و الخلف : الظهر... و التخلف: التأخر۔(۸)

گویا یہ لفظ خلف، سے ماخوذ ہے جو اسم اور ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اس کے معنی پیچھے، بعد میں یا تاخیر سے آنے والے کے ہیں۔

اسی سے استخلاف یعنی قائم مقام ہونے، بعد میں آنے اور کسی کے جگہ لینے کا عمل، ترکیب پاتا ہے۔اس عمل سے گزرنے والے کو خلیفہ اور خود اس عمل کو خلافت کہا جاتا ہے۔

القاموس میں اس سلسلہ میں جو لغوی بحث ہے اس کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے:

الخليفة جبل مشرف على اجياد الكبير... و الخليفة السلطان الأعظم و يؤنث كالتخليف ج خلائف و خلفاء و خلفه خلافة كان خليفة و بقى بعده (۹)

گویا خلیفہ بڑے پہاڑوں میں سے نمایاں اور ممتاز پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے ریاست کے سب سے بڑے حاکم کا نام خلیفہ ہوتا ہے۔اس لفظ کی جمع خلائف اور خلفاء آتی ہے۔اول الذکر قرآن میں چار اور ثانی الذکر تین مرتبہ مذکور ہے۔(۱۰)

علامہ مرتضی زبیدی نے اس کے معانی کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

والخلف : القرن بعد القرن (ایک زمانہ/طبقہ) کے بعد دوسرا)......و الخلف : المربد، أو الذي وراء البيت (اونٹوں وغیرہ کا) باڑہ یعنی گھر کے پیچھے کی عمارت)......الظهر بعينيه (بالکل اسی طرح پشت) خلفه أي: بعده (اس کے پیچھے آیا یعنی اس کے بعد واقع ہوا)......ان معانی کی روشنی میں انہوں نے خلف کا اسم فاعل خليفة اور خليف متعین کیا ہے۔اسی سے مصدر خلافت ہے:و خلف في قومه خلافة، بالكسر ، على الصواب و القياس يقتضيه، لأنه بمعنى الامارة۔(۱۱)

ان تمام مفاہیم کو سامنے رکھ کر امام راغب اصفہانی کے الفاظ میں خلافت کی درج ذیل جامع تعریف کی جاسکتی ہے:

الخلافة، النيابة من الغير اما لغيبة المنوب عنه و اما لموته و اما لعجزه و اما لتشريف المستخلف۔ (۱۲)

(خلافت دوسرے کی نیابت کا نام ہے خواہ یہ جانشینی اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے......اس کے عجز کی وجہ سے ہو یا نائب کو عزت وشرف دینے کی بنیاد پر اور یہی آخری سبب ہے جس کی بنیاد پر انسان کو خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے۔)

گویا خلیفہ، خلف سے ماخوذ ہے جس کے معنی بعد میں آنے ،نمایاں ہونے ،قائم مقام یا نمائندہ ہونے ،سربراہی کرنے ،ذمہ داری ادا کرنے اور معزز و مشرف ہونے والے کے ہیں اور خلیفہ کے اس مقام وحیثیت ،ذمہ داری اور حدود کار کا نام خلافت ہے۔

اصطلاحی مفہوم

خلیفہ اور خلافت کے اس لغوی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے ہم جمہور مفسرین کی ان آراء کا مطالعہ کریں گے جو مذکورہ بالا آیت خلافت کے ضمن میں لفظ'' خلیفہ '' کی تشریح میں وارد ہوئی ہیں۔اس تجزیئے کہ ذریعے درج ذیل سوالوں کا جواب مطلوب ہے:

(i) خلیفہ سے مراد کون ہے؟ اور (ii) خلافت کی نوعیت کیا ہے؟

ابن جریر الطبری لکھتے ہیں:الخليفة، الفعلية، من قولك : خلف فلان فلانا في هذا الأمر اذا قام مقامه فيه بعده۔علامہ ابن الجوزی کے بقول:هو القائم مقام

غیرہ ......اسی طرح علامہ زمخشری اور امام رازی لکھتے ہیں: من یخلف غیرہ ... و یقوم مقامہ۔ علامہ قرطبی کے مطابق: (خلیفہ) یکون بمعنی فاعل، أی یخلف من کان قبله من الملائكة فی الأرض أو من كان قبله من غير الملائكة على ما روى ... امام الشوکانی فرماتے ہیں: و الخليفة هنا معناه الخالف لمن كان قبله من الملائكة ۔(۱۳)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلیفہ کے معنی قائم مقام ہونے والے اور کسی دوسرے کے بعد اس کی جگہ لینے والے کے ہیں۔ اور یہاں اس سے مراد وہ ہستی ہوئی جو زمین پر بسنے والی پہلی مخلوق کی جگہ اس کے بعد لے گی۔ ابن جریر لکھتے ہیں:

وذالك الخليفة هو آدم ومن قام مقامه فى طاعة الله والحكم بالعدل بين خلقه۔(۱۴)

یعنی یہاں خلیفہ سے مراد آدمؑ ہیں اور ہر وہ شخص کہ جو اللہ کی اطاعت اور مخلوق خدا کے درمیان عدل کی حاکمیت کے لحاظ سے آدم کا قائم مقام ہو۔ اس سلسلہ میں امام قرطبی کی بھی رائے یہی ہے کہ خلیفہ ہونے کے مصداق آدمؑ ہیں۔ کہ وہ زمین پر اللہ کے پہلے رسول اور اللہ کے احکام و ہدایات کو جاری کرنے کے حوالے سے اس کے نائب ہیں۔ اس بات پر ابن عباس اور ابن مسعود سمیت تمام مفسرین متفق ہیں۔(۱۵)

امام الشوکانی لکھتے ہیں کہ خلیفہ یہاں آدمؑ کو کہا گیا ہے اور ہر اس فرد کیلئے جو زمین کی نیابت پر فائز ہو...... اسی طرح علامہ طنطاوی نے اس مفہوم اور اس کے اطلاق میں یوں اضافہ کیا ہے کہ خلیفہ سے مراد آدمؑ ہیں اور اسی طرح تمام انبیاء اللہ کے نائبین ہیں۔ انسانوں کے اجتماعی معاملات اور ان کی ہدایت کے اہتمام میں، اپنے اپنے درجے اور باری پر جو کہ اللہ کے فیض سے انہیں عطا ہو۔(۱۶)

علامہ آلوسی نے خلیفہ کی جامع تشریح یوں کی ہے:

الخليفة ... من يخلف غيره وينوب عنه والهاء للمبالغة، ولهذا يطلق على المذكر و المشهور ان المراد به آدم عليه السلام ... انه خليفة الله فى ارضه ، وكذاكل نبى استخلفهم فى عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل

لنفوسهم وتنفيذا مره.(۱۷)

مطلب یہ ہوا کہ خلیفہ سے مراد وہ ہستی ہے جو کسی دوسرے کے بعد آئے اس کی جگہ لے، اس کی ذمہ داریاں ادا کرے یا اسکا نائب بن کر کام کرے...... (یہاں ۃ مبالغہ کی ہے اور مذکر پر دلالت کرتی ہے)...... اور یہ بات معروف ومعلوم ہے کہ یہاں آدمؑ، خلیفہ کے مصداق ہیں کہ وہ زمین پر اللہ کے نائب ہیں جس طرح سارے انبیاء خلافت سنبھالتے رہے۔ زمین کی آباد کاری، انسانوں کے اجتماعی معاملات کی تہذیب اور ربِ کائنات کے احکام کی تنفیذ کے معاملات میں۔

عمومی اور خصوصی خلافت

خلیفہ اور خلافت کا مندرجہ بالا مفہوم اس حدیث سے بھی ماخوذ ہے جس میں رسول خدا ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل کی سیادت انبیاء کرتے تھے۔ اور یہ مفہوم ان قرآنی آیات سے بھی مطابقت رکھتا ہے جن میں بعض انبیاء کی خلافت (زمین میں ریاستی حاکمیت) کا باقاعدہ ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل ذکر داود علیہ السلام کی خلافت سے متعلق سورہ صٓ کی چھبیسویں آیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ

'اے داوٗد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے پس آپ لوگوں کے درمیان سچائی کا فیصلہ کیجئے اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے'۔

گویا اس آیت میں خلافت کا پورا دستور آ گیا ہے اور وہ یہ کہ:

خلیفہ کا تقرر اللہ کی طرف سے، زمین کے لیے ہے، اور اس ذمہ داری کا بنیادی کام انسانوں کے درمیان عدل کی حاکمیت ہے، اور یہ خواہش نفس سے اجتناب پر مبنی ہونی چاہئے۔ یاد رہے کہ "حکم" کا لفظ قرآن میں حکومت اور عدالت (یعنی حاکمیت اور منصفی) دونوں کے لئے مشترک استعمال ہوتا ہے۔ (۱۸) علامہ ابن کثیر اس آیت کی تشریح یوں فرماتے:

هذا وصية من الله عزوجل لولاة الأمور ان يحكموا بين الناس بالحق المنزل من عندهٔ تبارك وتعالى الا يعدلوا عنه فيضلوا عن سبيل

اللہ۔(۱۹)

گویا یہ ہدایت ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکومتی معاملات کو چلانے کی کہ انسانوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ حق کے مطابق فیصلے کیے جائیں اور اس دستور کی خلاف ورزی اللہ کی راہ سے بھٹکنے کے مترادف ہے۔.........اس اصول کی تاکید قرآن نے خلافت یوسف کے تذکرہ میں بھی اٰتَیۡنٰـهُ حُكۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ(۲۰) کے ارشاد سے کی اور خلافت ارضی کو حکم اور علم کیساتھ مربوط کر کے، راستی کیساتھ مشروط کیا ہے۔ یعنی اس شرط کے بغیر انسان خلافت کے مرتبے سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس دستور کی مزید وضاحت سورۃ الاعراف کی وہ آیات کرتی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی جانشینی کے حوالے سے حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوئی ہیں:

وَقَالَ مُوۡسٰى لِاَخِيۡهِ هٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِىۡ فِىۡ قَوۡمِىۡ وَاَصۡلِحۡ
وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِيۡلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝

'اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میری قوم میں میری نیابت کا فریضہ انجام دیجئے اور اصلاح کا کام کرنا ہے، فساد پھیلانے والوں کے ہاتھوں استعمال نہیں ہونا ہے'

اس سے معلوم ہوا کہ خلافت اصلاح و فلاح کے راستے پر، راستی سے چلنے اور معاشرے کو فساد سے محفوظ رکھنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس معیار پر پورا نہ اترنے پر حضرت موسیٰؑ اپنی قوم اور بھائی سے ناراض ہوئے، اور اس اصول پر کاربند نہ رہ سکنے پر انکی مذمت کی:

وَلَمَّا رَجَعَ مُوۡسٰٓى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۙ
قَالَ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ.....الآیہ۔(۲۱)

ثابت یہ ہوا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں غفلت و کوتاہی کی صورت میں خلافت اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتی ہے، جس سے راستی اور عدل کے راستے پر چلنا ممکن نہیں رہتا۔ جبکہ قرآنِ مجید کا یہ فیصلہ ہے کہ انبیاء کی بعثت انسانوں میں قیام قسط و عدل کیلئے ہوئی ہے:

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ
وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ......(۲۲)

'تاکید ہم نے رسولوں کو بھیجا واضح دلائل کیساتھ اور ان کے ساتھ نازل کی کتابیں اور

حق وباطل میں تمیز کا پیمانہ تاکہ انسان عدل پر قائم ہوں'۔

خلافت کی حقیقت

خلیفہ اور خلافت کی اس تعریف اور وضاحت کیساتھ کچھ سوالات ایسے ابھرتے ہیں کہ جن کے جواب کے بغیر بات نامکمل رہے گی۔ وہ سوالات درج ذیل ہیں:

ا۔ خلیفہ کے تقرر کا اختیار اور حق کس کے پاس ہے؟...... آیا یہ خلافت اللہ کی نیابت ہے یا انسان سے پہلے زمین پر موجود مخلوق کی جانشینی اور قائم مقامی۔

ب۔ یہ خلافت آدمؑ کو انسان ہونے کیوجہ سے عطا ہوئی یا نبی ہونے کی بنیاد پر؟ (یعنی اگر نبی ہونے پر تھی تو آخری رسول ﷺ کیساتھ مکمل ہوگئی بصورت دیگر جاری ہے)

ج۔ آیا ہر انسان اپنی حیثیت میں (محض انسان ہونے کی وجہ سے "خلیفۃ اللّٰہ" ہے یا خلافت منتخب انسانوں کو خاص خصوصیات اپنانے پر ہی حاصل ہوتی ہے؟

د۔ اسلامی تعلیمات میں خلافت کا بطور سیاسی اصطلاح کے کیا مفہوم ہے اور اسکا اطلاق کس طرح کی حکومت پر ہوتا ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب گذشتہ صفحات میں مفسرین کی ان آراء سے واضح ہو چکا ہے جو ہم نے خلافت آدم کے سلسلہ میں نقل کی ہیں۔ اس سلسلہ میں آیت خلافت...... اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً...... اور اس کے سیاق وسباق سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلیفہ بنانے کا حق، اختیار اور قدرت تو اسی کو ہوگی جو اس حیثیت کا اصل مالک ہو، جس کی نیابت عطا کرنا مقصود ہے۔ اور یہ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہ (۲۳)

اس سوال کے دوسرے حصے والا معاملہ اس لیے اہم ہو جاتا ہے کہ خلیفہ کا اولین معنیٰ 'کسی دوسرے کے بعد اس کی جگہ لینے والا' کے ہیں...... اس لحاظ سے علامہ قرطبی اور امام الشوکانی کی وہ آراء جو ہم لفظ خلیفہ کے معانی کے سلسلہ میں تحریر کر چکے ہیں، قابل غور ہیں۔ اس مفہوم کی روشنی میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ آیت خلافت کے الفاظ دراصل اللہ تعالیٰ کیطرف سے ایسی مخلوق بنانے کا اعلان ہے جو اس زمین پر پہلے سے ... ملائکہ یا غیر ملائکہ کی جگہ لے سکے۔

یہ رائے دراصل عبداللہ بن عمرؓ اور ابوالعالیہؒ (وغیرہ) کی ان روایات سے ماخوذ ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ آدم کی تخلیق سے پہلے فرشتے اور جنات بھی زمین پر آباد رہے اور جنات کے فتنہ وفساد کی بنیاد پر ہی فرشتوں نے خلیفہ کی تخلیق کے فیصلے پر رب کائنات کی عدالت میں عرض کیا تھا کہ یہ خلیفہ، پہلوں کیطرح زمین میں فساد کا باعث بن جائے گا۔

عبدالرحمٰن ابن الجوزی نے خلافت کے بارے میں دو قول نقل کیے ہیں: احدهما: انه خليفة عن الله تعالى فى اقامة شرعه ودلائل توحيده والحكم فى الخلقه ، وهذا قول ابن مسعود، مجاهد...والثانى: انه خلفه من سلف فى الارض قبله و هذا قول ابن عباس والحسن۔(۲۴)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقامت شریعت اور مخلوق پر حاکمیت کے لحاظ سے تو انسان اللہ کا نائب ہے اور جگہ لینے کے معنوں میں زمین کی سابق مخلوق کا قائمقام ہے......ابن کثیر نے ثانی الذکر مفہوم کی حامل روایات نقل کر کے اپنی رائے یہ دی ہے کہ یہ روایات قابل اعتبار نہیں۔(۲۵)

ہمارے خیال میں اگر یہ روایات درست بھی ہوں کہ انسان سے پہلے (جن وملائکہ میں سے) کوئی مخلوق زمین پر موجود تھی اور آدم ان کی جگہ پر آباد ہونے کی وجہ سے خلیفہ ہیں تو بھی آدم کے نائب حق تعالیٰ ہونے کی حیثیت پر اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ آیت خلافت کے سیاق وسباق میں آدم کے علم کی فوقیت کا باقاعدہ ذکر، اس کے مسجود ملائک ہونے کا مرتبہ اور زمینی زندگی میں بنی نوع انسان کا نظام زندگی دیکھ کر عقل قائل ہو جاتی ہے کہ یہ خلیفہ دنیائے انسانی کے معاملات سلجھانے میں اللہ کا نائب ہے نا کہ محض سابق مخلوق ارضی کی جگہ لینے والی ہستی۔

امام رازی کے قیمتی الفاظ سے اس رائے کو یوں تقویت ملتی ہے کہ:

انما سماه الله خليفة لأنه يخلف الله في الحكم بين المكلفين من خلقه و هو المروي عن ابن مسعود و ابن عباس و السدي، و هذا الرأي متأكد بقوله: انا جعلناك خليفة في الأرض فاحكم بين..ص: ٢٦ ـ(٢٦)

'بیشک اللہ نے (انسان کا) نام خلیفہ اس لئے رکھا کہ یہ وہ ہستی ہوگا جو اللہ کی مخلوق میں حاکمیت و منصفی کی ذمہ داری ادا کرے گا۔ یہی مفہوم ابن مسعود، ابن عباس اور سدی سے مروی ہے اور اسی خیال کو تقویت اس آیت سے ملتی ہے کہ" بے شک ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا پس

لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیجئے''۔

یہ رائے اس لئے بھی مستند ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک نے خلیفہ، تخلف اور استخلاف کے الفاظ اسی مفہوم میں جا بجا استعمال کئے ہیں۔

خلاصہ بحث

اس ساری بحث کا خلاصہ ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ خلافت آدم لفظی معنیٰ کے لحاظ سے سابق زمینی مخلوق کی جگہ لینے کا نام ہے لیکن اپنے حقیقی عملی مفہوم کے لحاظ سے دنیا میں اختیار وتصرف کا نام ہے۔ یہ تصرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت، اسی کے عطاء کردہ اصولوں کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے ہو تو انبیاء کی صورت میں، نیابت الٰہی ٹھہرتا ہے۔ بصورت دیگر محض سیاسی حاکمیت تک محدود رہتا ہے۔

قرآن نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ تمام انبیاء بنیادی طور پر انسان ہوتے ہیں۔ وہ ان کے لئے بنی آدم، بشر، انسان اور عبد کے اسمائے نکرہ استعمال کرتا ہے۔ تاہم ان کا یہ مقام اور امتیاز بتصریح بتاتا ہے کہ وہ اللہ کے پسندیدہ، برگزیدہ اور چنے ہوئے افراد ہوتے ہیں جن کی طرف وحی، فرشتے اور کتب کا نزول ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ نبی، مرسل، ھادی اور رسول کے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اس حیثیت میں وہ اللہ کی براہ راست نگرانی میں اس کے نائب اور نمائندہ کے طور پر کام کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ اس اعزاز کی بنیاد پر انسانیت کے راہبر اور امام ٹھہرتے ہیں۔ (۲۷)

لہٰذا نبی کو خلافت، بمعنی نیابت الٰہی، نبوت کی بنیاد پر ملتی ہے اور خلافت بمعنی تصرف في الدنیا انسان ہونے کی بنیاد پر عطا ہوتی ہے وہ بیک وقت دونوں معنوں میں خلیفة الله في الأرض ہوتے ہیں...... یہ خلافت خصوصی ہے جس کے مصداق تمام انبیائے کرام ٹھہرتے ہیں، البتہ زمینی بادشاہت اور ریاست کی حاکیمت (کے معنوں میں خلافت) کسی کسی نبی کو میسر آتی رہی ہے، تمام کو نہیں۔ بائبل اور قرآن کے بیان کے مطابق آدم چونکہ زمین پر پہلے انسان اور پہلے نبی تھے لہٰذا ان کی تخلیق اور بعثت وخلافت کا ذکر ایک ساتھ کر کے ایک خاص مدت تک کے لئے زمین پر روانہ کر دیا گیا۔ یوں ان کی خلافت ارضی انسان ہونے کی بنیاد پر تھی جبکہ نیابت الٰہی انہیں نبی ہونے کی وجہ سے عطا ہوئی۔ (۲۸)

قرآن کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ خلافت نبوت کے ساتھ مشروط نہیں، اگرایسا ہوتا توختم نبوت کے اعلان کے ساتھ ختم خلافت کا اعلان بھی کردیا جاتا...... خلیفہ ارضی کے لئے وَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ کی مہلت عمل، خلافت ارضی کے جاری رہنے پر دلالت کرتی ہے۔(۲۹)

البتہ خلافت بمعنی نیابت الٰہی اورامامت انسانیت ہرکس وناکس کیلئے مقدر نہیں۔ یہ کچھ شرائط اور معیارات کی بنیاد پر رب کریم کی طرف سے عطا ہوتی ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کا مطالعہ بہت ضروری ہے، جہاں رب کائنات کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کی امامت وخلافت کا اعلان بھی ہے اوراس کی بنیادی شرط کا تقرر واظہار بھی!

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاس اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

'اور جب ابراہیم کواس کے رب نے چند معاملات میں آزمایا اور وہ اس میں پورا اترا تو (رب نے) کہا کہ میں تمہیں انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔(ابراہیم نے) کہا میری نسل سے بھی؟ (امام بنائیں گے) ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا'۔

یعنی انسانیت کی امامت کے لئے ابراہیم جیسی صفات سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اوصاف خلافت سے خالی.......... ظلم کی راہ پر چلنے والے اس کا مصداق نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ عدل، راستی اور نور سے دور ہٹ جانے کا معنی ظلم ہے اور اللہ کی طرف سے امامت انسانیت کا وعدہ ظالموں کے لئے نہیں ہے۔۔ اس کے علی الرغم یہ وعدہ ایسے لوگوں کے لئے قرآن میں ہمیشہ کے لئے درج کردیا گیا ہے جو ایمان وعمل کے ان معیارات پر پورے اتریں جو خلافت کے شایان شان ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ...... الآیہ(۳۰)

اس آیت کی تشریح میں مولانا مودودیؒ رقمطراز ہیں:

قرآن مجید دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق وسباق سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ''خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حاصل ہونا'' اس معنی میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں ''خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امرِ شرعی (نا کہ محض امرِ تکوینی) کے تحت اختیارات خلافت کو استعمال کرنا'' اس معنی میں صرف مؤمن صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے کیونکہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے اور اس کے برعکس کافر و فاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے ملک میں اس کے دیئے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے معنی ہیں ''ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا''............ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی ''نیابت'' سے ماخوذ ہیں اور یہ آخری معنی خلافت بمعنی ''جانشینی'' سے ماخوذ۔ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغت عرب میں معروف ومعلوم ہیں۔ (۳۱)

تاہم ہر انسان ان معنوں میں ضرور خلیفہ ہے کہ وہ اپنے سے پہلی انسانی وغیر انسانی مخلوق ارضی کا نعم البدل ہے اور دنیوی زندگی میں اختیار وتصرف کا مالک ہے۔ اسی خلافت کا ایک اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی انسانی اجتماعیت کو زمینی ریاست کا اقتدار یا کسے معاشرے کی سیادت، کچھ بنیادی اوصاف کے بدولت حاصل ہو جائے۔ یہ خلافت انسانوں میں نسل درنسل منتقل ہوتی رہتی ہے...... اس تاریخی روایت کی تصدیق، کتاب الٰہی سے یوں ہوتی ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ .... الآیہ

'اور وہی ہے اللہ جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا اور بعضوں کو بعضوں پر درجات میں بلندی دی تا کہ تمہیں آزمایا جائے اس میں کہ جو کچھ، تمہیں اس نے عطا کیا'

خلافت کی یہ منتقلی بالترتیب (i) قوم نوح سے عاد کی طرف (ii) عاد سے قوم ثمود کی طرف (iii) ثمود سے بنی اسرائیل کیطرف اور (iv) بنی اسرائیل سے اہل عرب اور امت مسلمہ کیطرف۔ قرآن نے سورہ ال عمران میں بیان کی ہے۔ (۳۲)

دور جدید کے مفسرین نے آیت خلافت کی روشنی میں انسان کی اسی خلافت عمومی کے حوالے سے نئے پہلو اجاگر کیے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کی تخلیق، اس کی صلاحیتیں اور تسخیر

کائنات کی قدرت.......... خالق کائنات کی اس مشیت کا اظہار ہیں کہ اس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اپنی نیابت کے مرتبے پر فائز کیا ہے۔

شیخ طنطاوی فرماتے ہیں کہ انسان کو ذہنی و جسمانی لحاظ سے اسطرح ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے خلیفہ کے طور پر فرائض ادا کر سکے۔ انسان کا اپنے جسم پر اختیار، خالق کل کے، کائنات پر اختیار و تصرف سے کسی حدتک مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے حواس و اعصاب اس کی معاون مشینری ہے۔ جس طرح بادشاہ کے معاون اس کے وزراء و امراء اور حکومتی محکمے ہوتے ہیں، جو آپس میں مربوط ہو کر نظم مملکت چلاتے ہیں۔ تمام انواع مخلوق کی صفات کا مرقع بھی انسان کو بنایا گیا ہے۔ اور جس طرح کہ ہر مخلوق اپنے ہدف اور مقصد تخلیق سے مطابقت رکھتی ہے، اسی طرح انسان ان تمام تر صفات سے مزین ہے جو کہ ایک خلیفۃ اللہ کے لیے ضروری ہیں۔ اور علامہ رشید رضا کے بقول اس حقیقت کے آثار زمین اور اس کی وسعتوں میں ہر پہلو سے نمایاں ہیں۔ اس کے علمی اکتشافات اور عملی تسخیرات...... اس کے خلیفہ ارضی ہونے کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

سید قطب شہید کے بقول جب اللہ تعالی کی مشیت یہ ہوئی کہ انسان کو زمین کی زمام کار عطا کرنا ہے تو پھر اسکو اس مرتبے کے شایان شان قوتیں بھی عطا کی گئیں تا کہ یہ رضائے الٰہی کے تقاضے پورے کر سکے..... اسے علم کی طاقت، اس کے ہاتھ میں قوت، زمین کے وسائل اور مخفی خزانے سپرد کر دیئے گئے۔ نوامیسِ قدرت میں ہم آہنگی، ربط اور ترتیب کے ذریعے کائنات کی تسخیر انسان کے لیے آسان کر دی گئی تا کہ وہ خلافت کے تقاضوں کو پورا کر سکے..... یہ منصب خلافت دراصل انسان پر: اللہ کا عظیم احسان ہے، اس کی عزت افزائی ہے اور وسیع کائنات میں اس کے بلند مرتبے کا اعلان ہے۔ (۳۳)

زمین پر اس انسانی مقام کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خلیفہ کے مفہوم کا ایک دوسرا پہلو اجاگر کیا ہے۔ وہ سورۃ البقرۃ کی آیت: ۳۰ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے، خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اختیارات اصل مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے اگر وہ خود اپنے آپکو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے

سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

دوسری جگہ (سورہ احزاب کی آیت ۷۲: کی روشنی میں) انہوں نے خلافت اور خلیفہ کے الفاظ کا جامع مفہوم یوں بیان کیا ہے:

خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے، اور یہ دونوں لفظ نظامِ عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ ہے (Delegated) لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ (Delegated Power) کو امانت سے تعبیر کیا ہے، اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیاراتِ مفوضہ کو استعمال کرتا ہے، اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے۔ اس تشریح کے مطابق خلیفہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔ (۳۴)

گویا زمین پر انسان کی حیثیت دوگونہ اختیار رکھتی ہے۔ ایک طرف تو وہ خالق حقیقی کا نائب اور نمائندہ ہے...... بشرطیکہ وہ اخلاقی لحاظ سے اس کا اہل بھی رہے۔ دوسری طرف وہ زمین کی سیاسی حاکیت کا بھی حقدار ہے...... بشرطیکہ وہ مطلوبہ شرائط پر پورا اترے۔ دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے وہ حقیقی خلیفہ تب ہی قرار پائے گا جب وہ خالق و مالک حقیقی کی ہدایات پر عمل پیرا رہے، بصورت دیگر وہ خلافت کی نعمت عظمٰی سے محروم رہے گا۔

علماء و حکما کی طرف سے لفظ خلیفہ کی یہ تشریح...... انسان کی تخلیق اور کائنات میں اس کے مقام کے حوالے سے قرآنی تصور کے عین مطابق ہے۔ کلام الٰہی اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے، چند نکات کی صورت میں اس کا خلاصہ حسب ذیل بنتا ہے:

ا۔ انسانی تخلیق خصوصی توجہ سے، خاص مقصد کے تحت، با قاعدہ اہتمام کے ساتھ ہوئی ہے۔

ب۔ یہ مخلوق اعلیٰ بنیادوں پر، بہترین صلاحیتوں کے ساتھ، متوازن اور متناسب طبعی خواص سے مزین کی گئی ہے۔

ج۔ بنی آدم کو ضروری وسائل، تسخیر کائنات کا ملکہ اور مخلوق میں عزت و تکریم سے نوازا

گیا ہے۔

د۔ انسان کو آزادیٔ ارادہ کے ساتھ تصرف فی الدنیا رکھنے والی کائنات میں واحد صاحب اختیار ہستی بنایا گیا ہے۔

ر۔ یہ اعزازات واختیارات اسے ایک مہلت عمل کے ساتھ، بطور امانت عطا ہوئے ہیں اور انسان اس امانت خلافت کے بارے میں اپنے مالک حقیقی کے سامنے جوابدہ ہے۔(۳۵)

خلافت......بطور سیاسی اصطلاح

گزشتہ صفحات کے تحقیقی مطالعہ کے ذریعے قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خلافت بمعنی نیابت الٰہی کے اولین مصداق انبیائے کرام ہیں، جنہیں رب کائنات نے انسانوں کی ہدایت وامامت اور اپنی نیابت کے لئے منتخب کیا۔ قرآن کے اعلان کے مطابق انبیائے کرام کا مقدس سلسلہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ختم ہو چکا ہے۔(الاحزاب :۴۰) لہٰذا اب کسی نبی کے بطور' خليفة الله في الأرض 'مبعوث ہونے کے تمام امکانات مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں۔ مولانا محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

خاتم الانبیاء ﷺ کا زمانہ خلافت و نیابت تا قیامت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفۃ اللہ ہیں: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ...... (الاعراف:۱۵۸) آپ کی وفات کے بعد نظام عالم کے لئے جو نائب ہوگا وہ خليفة الرسول اور آپ کا نائب ہوگا۔(۳۶)

گویا قرآن کے اس وعدۂ خلافت کے مطابق جو سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں اہل ایمان سے کیا گیا ہے، زمینی حاکمیت کے مرتبے پر فائز ہونے والا اہل ایمان کا سربراہ، بطور' خليفة الرسول 'کے، مسند خلافت پر متمکن ہوگا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ...... الآیۃ

مفسرین قرآن اور علمائے اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ سورہ النور کی آیت ۵۵

کے وعدہ حق کی تکمیل، امتِ مسلمہ میں 'خلافت راشدہ' کی صورت میں ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر علامہ ابن العربی کی رائے درج کی جاتی ہے:

و قال علماؤنا : هذه الآية وعد حق و قول صدق، بدل ذلك على صحة امامة الخلفاء الأربعة ، لأنه لم يتقدمهم أحد في الفضيلة الى يومنا هذا ، فأولئك مقطوع بامامتهم ، متفق عليهم و صدق وعد الله فيهم۔(۳۷)

گویا خلافت کی اصطلاح تاریخ اسلام میں رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس سے مراد دین و دنیا کے معاملات میں رسول خدا ﷺ کی نیابت ہے۔ ادارہ خلافت، رسول خدا ﷺ کے بعد سقیفہ بنو سعد میں اس وقت معرض وجود میں آیا جب کھلے عام مباحثہ اور مشاورت کے ذریعے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مسلمانوں نے اپنا سربراہ منتخب کیا۔ آپؓ کو 'خلیفة الله' کے نام سے پکارا گیا تو آپ نے فوراً تصحیح کی کہ میں 'خلیفة الرسول' ہوں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کو پہلے پہل 'خلیفة خلیفة الرسول ﷺ' کے خطاب سے یاد کیا گیا جو بعد میں خلیفہ تک محدود ہو گیا اور صحابہ کے پکارنے پر آپؓ کے عہد سے 'امیر المؤمنین' کا لفظ خلیفہ کے لئے مخصوص ہو گیا۔(۳۸)

جناب رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے لئے خلافت کا لفظ خود رسول خدا ﷺ کی احادیث سے ماخوذ ہے جن میں آپ نے خلافت کے زمانہ تک کی تخصیص فرمادی تھی۔ ارشاد ہوا:

تکون النبوة فيكم ما شاء الله أن تكون ثم يرفعها
إذا شاء أن يرفعها ثم تكون خلافة على منهاج النبوة
فتكون ماشاء الله أن تكون ثم يرفعها إذا شاء الله
أن يرفعها ثم تكون ملكا۔

یعنی تمہارے درمیان نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے اور جب وہ چاہے گا اس کو اٹھانا، کرنے کے لئے لفظ امامت یا امارت بھی استعمال ہوا ہے۔

امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لئے استعمال ہوتی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔(۴۱)

الغرض خلافت کی اصطلاح ریاست کیلئے استعمال ہو یا (امامت/امارت) حکومت کے لئے اس سے مراد نبی آخرالزماں کی نیابت و جانشینی ہے جس کا مقصد دین کی حفاظت، دنیا کی اصلاح اور انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ان اصولوں کی بنیاد پر جو کہ خود رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی روشنی میں رب کائنات کی براہ راست ہدایت کے تحت متعین کردیئے ہیں۔

اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت دراصل ہر اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی جانشینی، نیابت اور پیروکاری ہی کا نام ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آغاز سے ہی اپنے آپ خلیفة الرسول ﷺ کہلوانا پسند فرمایا اور یوں خلافت کی دستوری تعریف متعین کردی۔قرآن و حدیث کے متعین کردہ اصولوں اور واضح اعلان کے ساتھ، تاریخی حقائق اور عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں دور خلافت سے مراد، رسول اللہ ﷺ کے خلفاء اربعہ (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ) کا عہد زریں (۱۱ تا ۴۰ھ) ہے۔یہی حقیقی معنوں میں رسول خدا ﷺ کی نیابت ہے جو تاریخ انسانی میں خلافت راشدہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے خلفاء کے ساتھ 'الراشدون' یا 'راشدین' کا اضافہ اور آپ ﷺ کی جانشین حکومت کے لئے 'خلافت راشدہ' کی اصطلاح دراصل قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ سے ماخوذ ہے۔قرآن پاک میں ہے: قَدْتَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ...امام راغب کے مطابق: الرشد، غی کی ضد ہے اور یہ لفظ، ہدایت اور راست روی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۴۲)

گویا خلافت راشدہ سے مراد 'راست رو حکومت' یا 'ہدایت یافتہ حکومت' ہے۔ چونکہ خلافت راشدہ کے مصداق صرف وہ خلفاء ٹھہرتے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کی براہ راست تربیت کا برسوں تک شرف حاصل رہا اور وہ مسلسل رسول اللہ ﷺ کی مجلس مشاورت کے رکن رہے، لہٰذا مسلمانوں میں ان کی سیاسی حاکمیت کا نام 'خلافت راشدہ' قرار پایا۔ جناب رسول کریم ﷺ کے درج ذیل فرمان نے ان کے لیے یہ اصطلاح مخصوص کردی:

علیکم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدین. (۴۳)

'تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کے قانون کی اطاعت واجب ہے۔'

ابن الاثیر کہتے ہیں کہ رشید وہ ہے جو عوام خلق کی راہنمائی ان کے عام مصالح مقاصد اوران کی عمومی فلاح کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرے۔اسی طرح علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ رشد سے مراد ہی راہنمائی کا اعلیٰ اور کامل نمونہ ہے......ایسی کامل راہنمائی جو دین ہی نہیں دنیا کے معاملات سے بھی تعلق رکھتی ہو اور نوامیس الٰہیہ، خدائی قوانین کے مطابق ہو:

وهو الرشد الكامل .... الاهتداء الى وجوه الصلاح

في الدين و الدنيا و الارشاد بالنواميس الالهية .(۴۴)

خلافت راشدہ کا یہ مفہوم اس حکومت کے صحیح اور واجب التعمیل ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بات مکمل طور پر جناب رسول کریم ﷺ کی اس حدیث سے واضح ہو جاتی ہے جو علامہ آلوسی نے قرآنی آیت: و شاورهم في الأمر .. (آل عمران:۱۵۹) کی تشریح میں درج کی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو شوریٰ کی ضرورت نہیں، لیکن اللہ نے قانون شوریٰ امت کے لئے رحمت بنا کر جاری کیا ہے، جو اس قانون پر چلے گا وہ 'رُشد' کو ہاتھ سے نہ دے گا اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ گمراہی کے راستہ سے گم نہ ہوگا۔(۴۵)

یہ حدیث خلافت راشدہ کی اہمیت پر دلالت کرتے ہوئے نہ صرف اس کی توثیق کرتی ہے بلکہ انسانی ہدایت کا بنیادی معیار خلافت کے سیاسی نظام کو قرار دیتی ہے۔اس بنیاد پر خلفائے راشدین کی حکومت، دین اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے جس کو مانے بغیر مسلمان کا ایمان اور ہدایت پر ہونا قابل اعتبار نہیں۔لہٰذا مسلمانوں کی جب اور جہاں ریاست وحکومت قائم ہو اس کے لئے خلافت علی منهاج النبوة کی پیروی میں ہونا لازمی ولابدی ہے کیونکہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سورۃ النساء (آیت:۱۱۵) میں موجود ہے کہ:

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ہ

اور جو رسول ﷺ کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالے کہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اسے ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ البقرہ:۳۰،

۲۔ الطبری، محمد ابن جریر، جامع البیان: ۱/۱۹۹،
راغب اصفہانی، مفردات :۹۴،

۳۔ الروم:۲،۱، الاعراف:۱۰،۵۴،

۴۔ مفردات: ۱۶،

۵۔ الرازی، تفسیر الکبیر: ۱/۱۵۲،

۶۔ الانعام:۹۲، الشوریٰ:

۷۔ آل عمران:۹۶ الحج:۲۹،۳۳،

۷۔ البقرہ:۳۶، الاعراف:۲۴، عبدالماجد دریا آبادی، ترجمہ القرآن: ۱/۱۴۶، ۳۲۷،

۸۔ الاعراف:۱۶۹، مریم:۵۹، ابن منظور، لسان العرب : ۳/۸۲،۸۳،

۹۔ فیروز آبادی، القاموس المحیط: ۳/۱۳۷

۱۰۔ (ا) الانعام:۱۶۵، یونس:۱۶،۷۳، فاطر:۳۹، (ب) الاعراف:۶۹،۷۴، النمل:۶۲

۱۱۔ مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس: ۱۲/۱۸۴،۱۹۵،

۱۲۔ مفردات:۱۵۵،۱۵۶،

۱۳۔ جامع البیان: ۱/۱۹۸، ابن الجوزی، زاد المسیر : ۱/۶۰،
الزمخشری، الکشاف: ۱/۲۹،۴/۸۹، تفسیر الکبیر: ۱/۱۵۲،
القرطبی، الجامع لاحکام: ۱/۲۶۳، الشوکانی، فتح القدیر: ۱/۴۹،

۱۴۔ جامع البیان: ۱/۲۰۰،

۱۵۔ الجامع لاحکام: ۱/۱۶۳،

۱۶۔ فتح القدیر: ۱/۴۹، الطنطاوی، تفسیر الجواہر: ۱/۵۲

۱۷۔ آلوسی، روح المعانی: ۱/۲۲۰،

۱۸۔ امام راغب اصفہانی، مفردات: ۲۵۳،

۱۹۔ تفسیر القرآن العظیم: ۴/۳۲،

۲۰۔ یوسف: ۲۱،۲۲،

۲۱۔ آل عمران: ۱۴۲،۱۵۰،

۲۲۔ الحدید: ۲۵،

۲۳۔ الاعراف: ۵۴،

۲۴۔ زادالمسیر: ۱/۶۰،

۲۵۔ تفسیر القرآن العظیم: ۱/۷۱،

۲۶۔ تفسیر الکبیر: ۱/۱۵۲

۲۷۔ الاعراف: ۳۵، ابراہیم: ۱۱، الانعام: ۱۳۰، مریم: ۳۰، الحدید: ۲۵،۲۶،
الشوریٰ: ۵۱، الشعراء: ۹۳، الانعام: ۸۵، الجمعہ: ۲، آل عمران: ۳، البقرۃ: ۱۲۴،

۲۸۔ یوسف: ۲۱،۲۲، ص: ۲۶، پیدائش ۲: ۵،۷، ۳: ۲۴، ۵: ۱،۲، البقرۃ: ۳۰ تا ۳۶،

۲۹۔ الاحزاب: ۴۰، البقرۃ: ۳۶،

۳۰۔ امام راغب، مفردات: ۳۱۵،۳۱۶، النور: ۵۵،

۳۱۔ سید مودودیؒ، تفہیم القرآن: ۳/۴۱۸،

۳۲۔ الانعام: ۱۶۵، الاعراف: ۶۹،۷۴،۱۲۹، یونس: ۱۴

۳۳۔ تفسیر الجواہر: ۱/۵۴ تا ۵۶، سید رشید رضا، المنار: ۱/۲۵۷
سید قطب، فی ظلال القرآن: ۱/۶۵،۶۶، ۳۴۔ سید مودودی، تفہیم القرآن: ۱/۶۲،

۳۵۔ (ا) ص: ۷۵، ذٰریٰت: ۵۶، البقرۃ: ۳۰، (ب) التین: ۴، الانفطار: ۷
(ج) ہود: ۵، لقمان: ۳۰، الاسراء: ۷۰، (د) الانسان: ۳، الشمس: ۷،۸، الاعراف: ۱۱
(ر) الاحزاب: ۷۲، المومنون: ۱۱۵، التکاثر: ۸

۳۶۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن: ۱/۱۸۵،

۳۷۔ ابن العربی، احکام القرآن:۱۳۸/۳
۳۸۔ ابن خلدون، مقدمہ: ۱۵۹، حسن ابراہیم، النظم الاسلامیہ: ۲۸۸
۳۹۔ احمد بن حنبل، مسند احمد: ۳۴۱/۵ تا ۳۴۲
۴۰۔ رشید رضا، الخلافۃ: ۱۰، الماوردی، الاحکام السلطانیہ: ۵، مقدمہ ابن خلدون: ۱۷، شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء: ۲،
۴۱۔ امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست: ۱۵
۴۲۔ البقرۃ:۲۵۶، الحجرات:۷، مفردات: ۱۹۶،
۴۳۔ مسند احمد: ۲۷۳/۴، مجمع الزوائد: ۱۸۹/۵،
۴۴۔ ابن اثیر، الکامل: ۸۶/۲، روح المعانی: ۸۶/۱۷، ۴۵۔ ایضاً: ۱۶۶/۴،

باب دوم

عہد نبویؐ کی ریاستوں کا مختصر تاریخی جائزہ

اس سے پہلے کہ ہم رسول اللہ کی قائم کردہ ریاست اسلامی کا تحقیقی مطالعہ کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ربط کے لیئے ان تمام اہم ریاستوں کی سیاسی تاریخ کا طائرانہ جائزہ لیا جائے جو عہد نبوی میں موجود تھی اور جنکا سیاسی اد حکومتی نظام اپنے زمانے کے تناظر میں قابل ذکر حد تک ترقی یافتہ تھا۔ اسطرح ہمارے سامنے وہ پس منظر بھی نمایاں ہوگا جسمیں نبی آخر الزماں ﷺ نے منفرد قسم کی فلاحی ریاست کی بنیادیں رکھیں جسکی مثال ناپید تھی اور جو بعد میں ایک سنہری تہذیب کا گہوارہ ثابت ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے میں اردگرد کی ناکام ریاستوں کی اکثر آبادیاں اس نئی تہذیب کے سایہء عاطفت میں آگئیں۔

سلطنت روم

روم جو بعدازاں ایک عظیم الشان سلطنت کی شکل اختیار گیا ابتداء میں محض ایک 'شہری ریاست' تھا جسے چند قبائل پر مشتمل منتشر آبادی نے ایک دریا کے کنارے چند پہاڑیوں کے درمیان آباد کیا۔

دریائے ٹائیبر کے جنوب میں اطروسکیوں کی ریاست اور شمال میں لاطینی آریہ قبائل نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے ایک سالانہ میلے کے ذریعے ان کا آپس میں رابطہ بڑھا اور نئی بستی 'روما' وجود میں آئی۔ دونوں قوموں میں قیادت کی کشمکش خاصا عرصہ جاری رہی اور آخرکار لاطینی ہی غالب رہے۔(۱)

۲۹۰ قبل مسیح تک رومیوں نے وسطی اٹلی پر بھی قبضہ جمالیا اور اس طرح ان کی جنگیں

یونانیوں کے ساتھ بھی ہوتی رہیں۔ ۱۴۹ ق م میں کارتھیج کے ساتھ جنگ (Punic War) ہوئی جس کے ساتھ بھی لڑائی ہوئی رومیوں نے، اسے تہس نہس کر دیا۔ پہلی صدی قبل مسیح تک ان کی سلطنت یونان، ایشائے کوچک، شام اور فلسطین تک کے علاقے پر حاوی ہو چکی تھی۔ ایسے میں رومی جرنیلوں کے مابین اقتدار کے لئے کشمکش شروع ہو گئی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی ممالک کا جرنیل جولیئس Julius ۴۹ ق م میں اٹلی داخل ہوا، اور پوری ریاست پر قبضہ جمالیا۔ عمر بھر کے لئے ڈکٹیٹر مقرر ہوا اور 'قیصر Caesar' بن بیٹھا۔ ۴۴ ق م میں سینٹ کے ممبران نے اسے قتل کروا دیا اور مملکت کے دو حصے ہو گئے۔ مغربی حصے میں اوکٹیوئین نامی جرنیل اور مشرقی حصے (یونان) میں انٹونی نے اقتدار قائم کر لیا۔ ۳۲ ق م میں دونوں جرنیلوں میں جنگ ہوئی۔ اوکٹوئن کو فتح ہوئی، اس نے آگسٹس Augusus سینئر کا لقب اختیار کر کے دور قیصری بحال کیا اور وہ پھر ۱۴ عیسوی تک بادشاہ رہا۔ (۲)

سیاست وحکمرانی

نظام بادشاہت ترقی کرتا گیا اور سلطنت کا سیاسی وسماجی نقشہ ابھرتا چلا گیا۔ اگر چہ مجلس امراء Senate اور مجلس جمہور Concilium موجود تھی مگر برائے نام۔ ایک مخصوص گروہ اور جماعت کے لئے سلطنت مختص ہو کر رہ گئی۔ رومی سلطنت اگر چہ 'بہبود عامہ' کے اصول پر قائم تھی مگر عملاً اس طرف توجہ کم تھی۔ تاہم ریاست کی قانونی حیثیت زیادہ واضح ہو گئی اور رفتہ رفتہ ایک ایسی قومی ریاست معرض وجود میں آ گئی جس نے عالمگیر ریاست کا نصب العین اپنا لیا۔ (۳)

اب یہاں بادشاہت، اعیانیت اور جمہوریت کا مجموعی نظام سیاست کارفرما تھا۔ عوام پر امیر اور حکمران طبقہ کا اقتدار پائیدار حیثیت اختیار کرتا گیا اور امیر وغریب، آقا وغلام، مالک اور نوکر کے امتیازات پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ نمایاں اور مؤثر ہوتے گئے۔

شاہی انداز حکومت کی عیاشیوں کی ایک مثال دیکھیے کہ قیصر کی ایک دعوت میں جس میں سلطنت کی کئی ہزار امیر اور سردار مدعو تھے الوان واقسام کے کھانوں میں سے ایک کھانا محض موروں کی زبانوں کو بھون کر تیار کیا گیا تھا۔ شراب وشباب کی تفریح، ناٹک، تھیٹر، ناچ گانے اور تماشے۔۔۔ امراء کی دلجوئی کے سامان کے طور پر، عام تھے۔ عام لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی،

لوگ اولاد پیدا ہونے کو ایک بھاری مصیبت خیال کرنے لگے، ان کے گھر محفوظ تھے نہ عزت۔ غلاموں کی زندگی جانوروں سے بدتر تھی۔ ٹیٹوئس اور کلاڈیئس انسانوں کے وحشی درندوں کے ساتھ ہزاروں مقابلے کرواتے، جو محض تفریح کے لئے ہوتے تھے۔(۴)

دوسری طرف انہوں نے عمرانیات میں ایک حد تک ترقی کی۔ شہر آباد کئے، منڈیاں بنائیں، بازار آراستہ کئے، سڑکیں تعمیر کرائیں۔ غلاموں کی محنت پر زراعت میں ترقی کی۔ بڑی بڑی جاگیریں قائم کیں، مندر بنوائے اور بیرونی تجارت کی حوصلہ افزائی کی۔

رومیوں نے یونانیوں کے قانون کی تدوین نو کی اور آئین و دستور کے ارتقاء میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ وہ اس کارنامے پر اس قدر نازاں تھے کہ اپنی سلطنت کے علاوہ کسی ریاست کے قانون کے وجود ہی کو تسلیم نہ کرتے تھے۔(۵)

ان کا دعویٰ تھا کہ دنیا رومیوں کا گڑھ اور ملکیت ہے لہذا کسی قانون بین الممالک کی ضرورت بھی نہیں۔ اس رویے کا عملی اظہار ان کی دوسرے ممالک کے ساتھ جنگوں میں ہوتا ہے جو ایسی فوج لڑتی تھی جو کسی اخلاقی تربیت اور نصب العین کے بغیر محض دشمن کو نیچا دکھانے اور ذلیل و رسوا کر کے ختم کرنے کا مقصد عزیز رکھتی تھی۔

غلاموں کی تعداد مجموعی طور پر کروڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ کسی آقا پر کوئی غلام دست درازی کرتا تو اس کا پورا خاندان قتل کر دیا جاتا۔ جنگی قیدی، ذلت کے بچپن، مشقت کی جوانی اور بے رحمانہ تغافل کے بڑھاپے میں، پیدائش سے موت تک کے مراحل طے کر جاتے تھے۔

روم میں مسیحیت

۲۵ء کے قریب یہودیوں کے ملک فلسطین میں، جو کہ روم کے ماتحت تھا، یسوع مسیح علیہ السلام نے دینی مصلح کی حیثیت سے تبلیغ کا آغاز کیا اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ خدا کی بادشاہت قائم ہونے والی ہے جس میں نیکوکاروں، حلیموں، غریبوں اور براست بازوں کو ظلم سے نجات مل جائے گی۔ یسوع نے انسان کو انسان کے ساتھ محبت سے پیش آنے کا سبق دیا۔ ۲۹ء میں جب وہ یروشلم آ کر یہودیوں کے معبد میں داخل ہوئے تو لوگوں کا ایک جم غفیر، آپکو دیکھنے اور ایمان لانے کو جمع ہو گیا۔

آپ کا پیغام اور کام، کاہنوں اور سودی کاروبار کرنے والے یہودیوں کے لئے خطرہ بن گیا تو انہوں نے سازش کے ذریعے ان کو گرفتار کروا کے رومی حاکم پیلاطوس کے سامنے پیش کیا۔ حضرت عیسیٰ پر روم کے خلاف بغاوت کرنے اور خود بادشاہ بننے کا الزام لگایا گیا اور وہ بزعم خویش انہیں مصلوب کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

قرآن نے ان کے اس وہم کی تردید سورۃ النساء آیت: ۱۵۷ میں کی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں، خصوصاً سینٹ پال نے ان کی اصل تعلیمات میں آمیزش کے ذریعے مشرکانہ تصورات کو مسیحیت کے نئے مذہب کا روپ دے دیا۔ دوسری صدی مسیحی میں بحیرۂ روم کے کنارے دین مسیحی کے پیروکاروں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ (٦)

قسطنطین سے پہلے کے بادشاہوں نے دین مسیحی کے پیروکاروں کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ظالمانہ کاروائیاں شروع کر رکھی تھیں جبکہ اس نے نہ صرف سلطنت کو سنبھالا دیا بلکہ ۳۰٦ء میں عیسائیت کی بھی تنظیم نو کی۔ یونانی زبان کو دفتری زبان کا درجہ دیا اور عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دے کر روم کے بشب کو قیصر کا مشیر قانون مقرر کیا۔

چھٹی صدی عیسوی میں جسٹینین اول نے رومی قانون کی ترتیب نو کی جبکہ مسیحیت پوری طرح سلطنت کے امور پر حاوی ہو چکی تھی۔ اس دور میں طاعون کی وبا سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلی اور جسٹینین کی وفات کے بعد رومی سلطنت کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس کا دور حکومت ٦۵۔۵۲۷ء تک ہے۔ اس عرصے میں ایران کی توسیع پسندانہ بادشاہت کے حملے شروع ہوئے اور ۲۲۔٦۲۰ء میں ایران کے ہاتھوں روم کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا اور چند سال بعد ہرقل نے روم کو ٦۲۷ء میں پھر فتح دلائی۔ (۷)

روم پر غلبے کی خبر اور اس کے بعد رومیوں کے غالب آنے کی پیش گوئی قرآن نے (الروم: ۱۔۴) کی تھی اور یہی وہ زمانہ بلکہ وہ سال ہے جب رسول کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔

سلطنت ایران

تاریخ بادشاہت پر طائرانہ نظر

تاریخ فارس کا مطالعہ عام طور پر دو حصوں میں کیا جاتا ہے۔ایک افسانوی دور جس کی تاریخ، انسانی تاریخ جتنی پرانی ہے جس میں کیورث، طہورث، جمشید، فریدون، منچہر، کیقباد، کیخسرو، خسرو اعظم، گستاسپ اور لہراسپ وغیرہ کی بادشاہتوں کے دور شامل ہیں۔ یہ پیشدار یہ سلسلۂ شہنشاہی ہے۔دوسرا دور، تاریخی دور کے نام سے موسوم ہے جو کئی سو سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔طویل تاریخ کو چار مشہور طبقات میں یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پیشداریہ، کیانیہ، اشکانیہ، اور ساسانیہ۔(۸)

وسط ایشیا کے آریہ قبائل کی ایک شاخ نے، ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں، بحیرۂ خزر Caspian Sea کے جنوب میں ڈیرے جمائے۔ان کی نسلوں نے ساتویں صدی قبل مسیح میں تین ریاستیں قائم کیں۔شمالی اور وسطی حصے میں میدی قبائل نے میدیہ، جنوب میں اصفہان کے قریب پرسوماشی ریاست اور شیراز کے قریب پارسیوں کی ریاست جو فارس کے نام سے مشہور ہوئی۔ پرسوماشی کے حکمران کیقباد شکست دے کر پارس اور پارسوماشی کی دونوں ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ بادشاہ ایک بڑا فاتح اور عادل حکمران ثابت ہوا جسے تاریخ میں خسرو اعظم یا ذوالقرنین (دو سینگوں والا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(۹)

۵۵۰ ق م میں میدیا کے بادشاہ اشتومیگو کو شکست دے کر سائرس نے میدیا اور ۵۴۶ ق م میں لیدیا (ایشائے کوچک) کو فتح کیا۔اسی طرح ۵۳۹ ق م بابل پر چڑھائی کر کے اسے ایرانی سلطنت میں شامل کرلیا۔خسرو اعظم نے اپنی یہودن ملکہ کی سفارش پر بابل سے یہودیوں کو آزاد کروایا اور واپس یروشلم جانے اور معبد تعمیر کرنے کا فرمان صادر کیا۔اسی طرح اس نے بابلیہ (عراق) کے بت پرستوں کے متعلق رواداری سے کام لیا۔

یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس (Herodotus) (پانچویں صدی ق م) نے خسرو کی جنگوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جب کہ اس کے فرامین عراق کے کھنڈرات سے مٹی کی الواح یا پتھر کی سلوں پر کندہ ملے ہیں۔(۱۰)

اس بادشاہ کا ذکر عہد نامہ عتیق میں موجود ہے جبکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خسرو اعظم کو قرآن میں مذکورہ بادشاہ ذوالقرنین قرار دیا ہے، جس نے یاجوج ماجوج (ایشیا کے شمال مشرقی علاقے کی قومیں، یافث بن نوح کی نسل، روس اور شمالی چین کے قبائل: تاتاری، منگول، ہن،

سیھین اور پارتھی) کو روکنے کے لئے سد ذوالقرنین تعمیر کی۔(۱۱)

یہ بند نما، ۵۰ میل لمبی، ۲۹ فٹ بلند، ۱۰ فٹ چوڑی دیوار، دربند اور داریال کے درمیان تعمیر کی گئی تھی۔لوہے اور تانبے کے آمیزے کیساتھ، کوہِ قاف کے درے میں۔(۱۲)

خسرو اعظم کے جانشیں، اس کے بیٹے کمبائیس دوم نے ۵۲۹ ق م میں، مصر کے فرعون کو شکست دی۔اس کے بعد خسرو کے ایک مشیر کا بیٹا دارا (Darius-I) شہنشاہ بنا جس نے مشرق ومغرب میں مہمات بھیجیں اور بحیرۂ خزر سے لے کر بحیرۂ عرب اور خلیج فارس تک وسطی اور مغربی ایشیا کے تمام ممالک ایرانیوں کی وسیع سلطنت کے صوبے بن کے رہ گئے۔ دارا نے ڈاک کا نظام (گھوڑسوار ہرکاروں کے ذریعے) قائم کیا، سڑکیں بنوائیں اور ہر قسم کے انتظامات درست کئے۔ اس نے سیتھوں اور یونانیوں کے خلاف مہمیں بھیجیں۔ ۴۸۵ ق م اس کی وفات پر اس کا بیٹا اخسویرس بادشاہ بنا جو بائبل کے مطابق ۱۲۷ ممالک کا بادشاہ تھا۔ اس کے بعد ایرانی سلطنت اندرونی سازشوں کا شکار ہوئی اور یونانی بادشاہ فیلبوس (شاہ مقدونیہ) کے بیٹے سکندر Alexander نے ۳۳۱ ق م میں سرزمین بابل (عراق) میں گاوگیلا کے میدان میں فتح پاکر اس عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور قصر سوسن میں ایران کی بہت سی قیمتی سوغاتیں نذر آتش کر دیں۔(۱۳)

مذہب زرتشت

زرتشت ساتویں صدی قبل مسیح میں آذربائیجان کی بستی (ارومیہ میں خاندان پسی تاآما میں پیدا ہوئے اور) نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی جس سے خراسان کا بادشاہ گشتاسپ ان کا پیروکار بن گیا۔ یہاں قدیم دور سے دیوتاؤں کی پوجا ہو رہی تھی مگر زرتشت نے انہیں توحید سکھائی۔مرکزی اصول یہ پیش کیا کہ روشنی اور تاریکی (نیکی اور بدی) ایک قادر مطلق کے دو مظہر ہیں۔روشنی کا مظہر اہورمزدہ ھرمز (یزداں) ہے اور تاریکی کا مظہر اہرمن ہے۔ان دونوں کی کشمکش ،کائنات اور اس کے انقلابات کا باعث ہے۔آخرکار یزداں، اہرمن پر غالب آئے گا اور وہ قیامت کا دن ہوگا۔لوگ ازسرنو زندہ ہوں گے اور ان کے اعمال کا حساب ہوگا۔

اولمسٹڈ (Olmstead) نے زرتشت کے توحیدی مذہب پر یوں تبصرہ کیا ہے:

Zoroaster Had been a true monotheist for his Ahura Mazdah quite literally the one and only god. If he spoke of Good thought, piety and the like ; it was mere as a concession to man's inherent difficulty of thinking in abstract terms in reality they were simply attributes of the unique supreme deity.(14)

زرتشت کے پیروکار حکمرانوں نے ۵۳۹ سے ۳۳۴ ق م تک وسیع سلطنت پر حکمرانی کی۔ان کی مذہبی کتاب'اوستا Avesta' جواس وقت کی زبان'زند Zend'میں تھی،کے کچھ حصے آج بھی ملتے ہیں۔ان کے پیروکاروں کے مطابق زرتشت اللہ تعالی کے نبی تھے۔(۱۵) سکندر اعظم نے ایران کی سلطنت پر حملہ کیا تو قصر سوسن میں آوستا کے اصل نسخے بھی دیگر چیزوں کے ساتھ نذر آتش کر دیئے۔بعض محققین یورپ کا خیال ہے کہ زردشت حضرت دانیال یا حضرت یرمیاہ کے شاگرد تھے اور ایرانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔اس حقیقت کی طرف قرآن میں بھی اشارہ موجود ہے وہ یہ کہ قرآن نے ذوالقرنین کے ایمان کی تصدیق کی ہے جبکہ تاریخی طور پر یہ بات مسلم ہے کہ ذوالقرنین زردشت کے پیروکار تھے۔(۱۶)

زرتشت کی تعلیمات پاکیزہ تھیں اوران کے اجزاء انبیاء کی دعوت سے مماثل ہیں مگر دیگر مذاہب کی طرح زرتشت کی اصل تعلیمات کو طاقِ نسیاں کر دیا گیا۔قدیم آتش پرستی عود کر آئی اور داراسوم ۳۳۰ ق م کے بعد یہ مذہب گمنام ہو گیا حتیٰ کہ ساسانی دور حکومت میں آوستا کا نسخہ از سر نو مرتب کروایا گیا اور اردشیر نے مذہب کو پھر زندہ کیا۔تاہم زرتشت کی اصل تعلیمات کو بگاڑ کر مجوسیوں نے آتش پرستی کی قدیم آریائی رسم پھر تازہ کر لی۔نیکی اور بدی کے دو خدا بنا لیے اور یہ عقیدہ مستقل طور پر زرتشت کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔قرآن نے سورۃ النحل میں اس تصور کا ابطال کیا ہے۔(۱۷)

۲۴۲ء میں اس مذہب کے مجدد، مانی (پیدائش ۲۱۶ء کباتنہ) نے دعویٰ کیا کہ:

یزداں خدا ہے اور اہرمن شیطان۔میں یزداں کی طرف سے خلقِ خدا کی اصلاح کے

لیے مامور ہوا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی مامورین آتے رہے مگر ان کی تعلیمات میں آمیزش کردی گئی ،میری کوشش ہے ان کی اصل تعلیمات کو از سر نو جاری کروں۔

مانی نے ترکستان، ہندوستان اور چین تک کی سیاحت کی اور اپنے ماننے والے پیدا کر لیے۔ تاہم انہیں اصفہان سے گرفتار کر کے مصلوب کر دیا گیا۔ تفقاز کی سرزمین سے ایک خود ساختہ مصلح ،مزدک ظاہر ہوا۔ اس نے کہا کہ سارے جھگڑے زر، زن اور زمین کی وجہ سے ہیں ان کی مساوی تقسیم ضروری ہے تاکہ امیر و غریب کا فرق مٹ سکے۔ اس نے ہر حلال و حرام، جائز و ناجائز کی حدوں کو مٹا کر ہر گناہ کی کھلم کھلا اجازت دے دی۔ بہر حال اباحیت کی اس تحریک کو جلد ہی دبا دیا گیا۔(۱۸) چھٹی صدی میں چار مذاہب کے پیروکار ایران میں موجود تھے:

زرتشتی آتش پرست، نسطوری عیسائی، مانی کے پیروکار اور مزدکیت کے دلدادہ۔

شاہی دور میں انداز سیاست وحکمرانی

۲۶۰ء میں ساسانی حکمران شاہ پور اول نے جب شام پر چڑھائی شروع کی اور قیصر کو گرفتار کیا تو طویل سلسلۂ جنگ شروع ہو گیا جو تقریباً ۳۶۳ء تک جاری رہا۔ تاہم ساسانی خاندان شاہی کے زیر اہتمام ایران کی سلطنت بڑے تزک و احتشام سے دنیا میں ایک نمایاں مقام پر قائم رہی۔ ان حکمرانوں میں چند ایک بڑے نام یہ ہیں: شاہ پور اول کا دور حکومت اکتیس سال، سابور ذو الاکتاف بہتر سال، فیروز بن یزدگرد چھبیس سال، قباد پینتالیس سال اور نوشیرواں بیالیس سال اور خسرو پرویز ھرمز بتیس سال۔۔۔ کسریٰ پرویز کی دونوں بیٹیوں بوران اور آزرمید خدت کو بھی تخت پر جلوہ افروز ہونے کا موقع ملا۔ نبی آخر الزماں جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش کے زمانے میں نوشیرواں کا دور حکومت تھا۔(۱۹)

ایران میں اگرچہ شخصی، موروثی اور مطلق العنان بادشاہت قائم رہی مگر بزرگوں کی ایک مجلس مشاورت جو کہ درباری اور شاہی خاندان کے افراد پر مشتمل تھی، قائم رہی۔ یہ 'مجلس بزرگان' ایسے مواقع پر جب بادشاہ کم عمری میں تخت پر بٹھا دیئے جاتے تو ان کی مدد کرتی۔ مثلاً اردشیر کو جب بادشاہ بنایا گیا تو اس کی عمر ے سال تھی۔ لہذا اس کی مدد اور رہنمائی کے لئے مجلس شوریٰ نے 'مہاذر جنش' کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا۔(۲۰)

شاہانِ ایران کا طرز حکمرانی رومی بادشاہوں جیسا تھا۔ تاہم یہ حکمران علم و فن کے

قدر دان تھے اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ قدرے بہتر سلوک کرتے تھے۔ انہوں نے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر کے صوبے دار مقرر کیے۔ رعایا کی داخلی، معاشرتی زندگی اور مذہبی عقائد میں بہت کم دخل دیا۔ سڑکیں بنوائیں، محکمے قائم کیے۔ تاہم بادشاہ کی عظمت وجلالت کا سکہ بٹھایا گیا حتیٰ کہ بعض بادشاہوں نے خدائی کے دعوے کیے رکھے۔ (۲۱)

چھٹی صدی عیسوی کے آخر اور ساتویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ایرانی سلطنت زوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بادشاہوں اور روٗساء کی عیش پرستی کی بناء پر امور سلطنت سے غفلت، ریاست کی تنظیمی ہیئت میں کمزوری آئی، بغاوتیں اور سازشیں ہوئیں۔ سیاسی اداروں کو معاشرتی حالات نے بھی متاثر کیا۔ ایک طبقہ مسرفانہ زندگی گزار رہا تھا جبکہ دوسرا طبقہ محصولات اور حکومت کے مطالبات کی چکی میں پس رہا تھا۔ مانی مذہب کے پیروکاروں نے، مجوسیت اور مسیحیت کی آمیزش کے ساتھ، شہوت پرستی اور جنسی تحریکات کا لباس اوڑھ کر، اخلاقی دیوالیہ پن عام کر دیا۔ مزدکیت نے جو عیش پرستی اور ہوس رانی کی تعلیم کے ساتھ حرام وحلال کی تمیز مٹانے کے درپے تھے، جنسی بحران پیدا کر دیا۔ اگرچہ بہرام نے مانی اور نوشیرواں نے مزدکی مذہب کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر معاشرت اور سماج کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

جنگ کے کچھ نہ کچھ قوانین تو قدیم زمانے سے موجود تھے مگر دیگر ریاستوں کے ساتھ بدعہدی کا معاملہ کرنا، جنگ میں مفتوح کے شہر اور معابد تباہ کرنا، سفیروں پر ظلم وبربریت روا رکھنا، ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ اس سلسلہ میں مؤرخین کی دی ہوئی تفصیلات میں سے درج ذیل کی تین مثالیں ہی کافی ہیں:

قباد (۳۵-۵۰۱ء) نے جب حیرہ کے بادشاہ منذر کے خلاف شام پر حملہ کیا تو انطاکیہ کی ۴۰۰ راہبات کو پکڑ کر عزی کے بت پر بھینٹ چڑھا دیا۔ خسرو پرویز نے جب قیصر ماریس کا بدلہ لینے کے بہانے سلطنت روم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو اپنی مملکت میں کلیسا مسمار کر دیئے اور عیسائیوں کو آتش پرستی پر مجبور کیا۔ ۶۱۵ء میں جب اس نے بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں کے بطریق اعظم کو گرفتار کیا، اصل صلیب چھین لی، کنیسوں کو آگ لگا دی اور ۹۰ ہزار عیسائیوں کو قتل اور اسیر کیا۔ (۲۲)

دور شاہنشاہی کیومرث سے یزدگرد تک، ۴ ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ زوال

سلطنت خسرو پرویز کے ۳۲ سالہ دور حکومت کے بعد شروع ہوا۔ یہ وہ بادشاہ ہے جو رسول کریم ﷺ کی ہجرت مدینہ کے وقت ایران کا فرمانروا تھا۔

ہندوستان

ہندو سماج

ساڑھے تین ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ، وادئ سندھ میں زراعت پیشہ قومیں آباد ہونے لگیں جنہوں نے شہر اور قصبے آباد کر کے ان کے گرد فصیلیں بنائیں۔ وادئ دجلہ وفرات کے برتنوں سے ملتے جلتے برتن وادئ سندھ کے قدیم شہروں موہنجوداڑو اور ہڑپہ سے ملے ہیں۔ دو ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار ق م تک کے زمانہ میں آریہ قبائل ہندوستان میں پھیلتے چلے گئے۔

ان کے آثار وحالات کا پتہ مذہبی کتاب 'رگ وید' سے لگایا جاتا ہے۔ دوسری کتابیں پران اور اپنشد بھی ہیں جنہیں بقول ڈاکٹر حمید اللہ الہامی مانا جاسکتا ہے کیونکہ 'پران' لفظ پرانی یا قدیم کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن نے پرانے صحیفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لفظ 'زبر الاولین' یعنی 'پرانے لوگوں کی کتابیں' استعمال کیا ہے۔(۲۳)

پارسیوں کی کتاب 'ژند و آوستا' کے مطابق آریہ قبائل کی ایک شاخ 'ہاپتا ہندو' (پنجاب) ہندوستان کے علاقے کی طرف ہجرت کر گئی۔ یہ قبائل کابل اور ہلمند کی وادیوں سے چل کر کوہِ سلیمان کے دروں سے اندازاً ڈیڑھ ہزار ق م کے قریب آئے۔ 'ویدیں' (رگ وید، یجر وید، سام وید، اتھر وید) اسی دور کی الہامی کتابیں ہیں جو 'رشیوں' اور 'منیوں' پہ نازل ہوئیں۔ یہاں قدیم باشندے آریہ کے آنے سے قبل زراعت کی بنیاد پر زندگی گزار رہے تھے۔ ان دراوڑی نسل کے لوگوں کے ساتھ آریاؤں کی جنگیں ہوئیں اور آریہ غالب رہے، انہوں نے ریاستیں اور نو آبادیاں بنانے کی مہم پورے زوروں سے جاری رکھی۔ اس دوران میں دونوں قوموں کے اختلاط سے نیا تمدن اور نئی زبانیں جنم لینے لگیں۔ آریہ قوم کا سماج پدرسری (والد کی سربراہی) تھا، خاندان کا بزرگ راجہ کہلاتا۔ راجہ تمام انتظامی، عدالتی اور جنگی امور کا مالک تھا تاہم اس نے مشیروں کی ایک مجلس قائم کی ہوتی تھی جو اسے وقتاً فوقتاً مشورے دیتی۔ ویدوں کے زمانہ میں تو مقامی کونسل 'سبھا' اور مرکزی کونسل 'سمتا' بنی ہوئی تھی، بادشاہ کے اختیارات محدود تھے۔

بالآخر سمتا کو ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان کے شمالی حصہ میں اشرافیہ (Aristocracy) طرز کی فرمانروائی کا آغاز اسی دور میں ہوا جب یونان میں اس طرح کی حکومتیں ترقی پا رہی تھیں۔ تاہم ہندوستان میں مجموئی طور پر عام چلن بادشاہت کا ہی رہا۔ (۲۴)

راجاؤں کے نیچے شرفاء اور امراء کا طبقہ تھا۔ مذہبی رسمیں ادا کرنے کے لیے پروہتوں یا برہمنوں کی الگ جماعت تھی۔ اس کے علاوہ عام لوگ کسان، حرفہ کار اور تاجر ہوتے تھے۔ یہ لوگ مظاہر قدرت کی مخفی قوتوں یعنی دیوتاؤں کی پوجا کرتے جن میں اگنی (آگ) اندرا (بارش اور بجلی) دایو (ہوا) اور وردنا (آسمان) کے دیوتا تھے جبکہ اس سے پہلے پوجا یا عبادت، خدا کے تین مظاہر: برہما (پیدا کرنے ولا) ویشنو (وسائل دینے والا) اور شیوا (مارنے والا) کی مورتیوں کی ہوتی تھی۔ بعد میں یہی پوجا پاٹ کا نظام برہم راج اور معاشرتی طبقات کی بنیاد بنا۔ عبادت کی مخصوص رسمیں پروہت کی زیر قیادت ادا ہوتیں۔ (۲۵)

قدیم مذہبی ادب

ہندوؤں کے قدیم لٹریچر میں معروف ترین کتابیں 'مہابھارت' اور 'رامائن' دو قدیم معرکوں کی رزمیہ نظمیں، سنسکرت زبان میں ہیں، جن سے ان کی پرانی لڑائیوں اور خانہ بدوش سماج کا پتا چلتا ہے۔ جس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل کو شریعت سے نوازا اور توحید و آخرت کا درس دیا اسی دور میں کرشن چندر نے خدائے واحد کے عرفان کا پیغام ہندوستان میں دیا۔ بتوں اور مورتیوں کی پوجا سے روکنے کی کوشش کی۔ (۲۶)

ان کی تعلیمات 'گیتا' کی شکل میں موجود ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب 'منوسمرتی' سے ہندوؤں کے پیچیدہ مذہبی افکار کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ کتاب دراصل سیاسی و تمدنی قوانین کا مجموعہ ہے۔ یہ اس دور کی یادگار ہے جب ہندوستان میں پوری طرح غیر آریہ قومیں تباہ ہو چکی تھیں اور آریہ قوم کی تہذیب عروج پر تھی۔ منوسمرتی یا 'منوں کا دھرم شاستر' معاشرے کو چار طبقات میں تقسیم کرتا ہے: برہمن (مذہبی اور فکری پیشوا)، کھشتری (حکمران اور فوجی)، ویش (زراعت و تجارت کرنے والے) اور شودر (غلام۔ غیر آریہ قدیم قوم)۔

معاشرے میں طبقاتی تقسیم کے قدیم نظام میں ہندو برہمنوں نے نظریۂ اواگان یا تناسخ ارواح کو بہت پھیلایا ہے۔ اس عقیدے کے مطابق انسانی روح اپنے اچھے یا برے اعمال

کے مطابق 'جون' بدلتی رہتی ہے، اچھے اعمال والا دوسرے جنم میں اچھی حیثیت میں اور برے اعمال والا دوسرے جنم میں بری کیفیت میں واپس آتا ہے۔ اسی کے تحت غیر آریہ قدیم باشندوں کو شودر قرار دیا گیا۔

رامائن میں شری رام چندر جی کے بادشاہ بننے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ مہا بھارت کی جنگ کے بعد کے دور سے متعلق یہ کہانی نسبتاً ترقی یافتہ دور کی نشانی ہے۔ رام چندر جی کی اجودھیا واپسی کی تاریخ کو ہندوؤں میں عید کے طور پر منایا جاتا ہے اور ہر وقت رام رام جپنے کو عبادت سمجھا جاتا ہے۔ (۲۷)

ہندو راجدھانیاں

وادیٔ سندھ کی سرزمین قدیم زمانوں سے ریاستی بادشاہتوں اور علاقائی راجاؤں کی زیر نگرانی سیاسی طور پر منقسم رہی ہے۔ لہٰذا کوئی بڑی منظم ریاست چوتھی صدی قبل مسیح تک قائم نہ ہو سکی۔ ایران کی وسیع سلطنت پر جب خسرو اعظم یا سائرس حکمران تھا تو شمال مغربی ہندوستان کے علاقے میں، بمبیسارا Bimbisara کی شاہی، دریائے کابل اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقہ کو سائرس نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ بعد میں دارا اول (۵۲۲۔۴۸۸ ق م) نے کچھ اور علاقے بھی بڑھا لیے۔ ایرانی شہنشاہیت کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو مشہور یونانی فاتح سکندر اعظم نے ایرانیوں کو شکست دے کر بہت سے علاقے فتح کیے۔ ۳۲۷ ق م میں دریائے سندھ عبور کر کے بہت سی ہندوستانی ریاستوں پر یکے بعد دیگرے سکندر نے قبضہ کیا جن میں ٹیکسلا اور پورس سمیت کئی اہم راجدھانیاں شامل تھیں۔

پنجاب مین سکندر اعظم کی یلغار کے بعد بہار کے راجا، چندر گپت موریا نے پنجاب کو یونانیوں کے اقتدار سے نجات دلانے کے لئے لشکر کشی کی اور ہندوستان کے تمام راجوں کو جن کی ریاستیں، کوہستان اور بندھیاچل کے شمال میں تھیں اپنا مطیع بنا کر ایک متحدہ سلطنت وسط ہند کی بنیاد رکھی۔ چندر گپت نے ۳۲۴ سے ۳۰۰ ق م تک حکومت کی۔ انتظامی امور کو بہترین طریق پر چلانے والے اس بادشاہ نے حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ راجہ یا بادشاہ، جو سربراہِ ریاست تھا۔ اس کے پاس انتظامی اختیارات کے ساتھ ساتھ قانون سازی کا حق اور فوجی قوت کی سربراہی بھی تھی۔ دوسرا حصہ وزارتی کونسل Mantri Parisad تھی جس سے بادشاہ مشاورت کرتا تھا

حکمران کے مشوروں کا پابند نہیں تھا۔ وزیروں میں کچھ اعلیٰ مقام کے حامل تھے جنہیں بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اور اختیارات بھی زیادہ تھے۔ کچھ وزراء کم درجے کے تھے جنہیں ہنگامی ضرورت کے تحت ذمہ داریاں بھی دی جاتی تھیں۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے عہدیدار ہر شہر میں وارڈز کی سطح تک مقرر کئے جاتے تھے۔ ہر کام کے لیے مجلس انتظامی تشکیل دی جاتی اور ان مجالس کے کاموں میں صنعت وحرفت کی ترقی ونگرانی، بیرونِ ممالک کے افراد کی مہمانداری، پیدائش اور اموات کا اندراج، دوکانداروں کے اوزان وغیرہ کی چیکنگ اور فراڈ اور دھوکہ دہی کے مقدمات کا احتساب کرنا شامل تھا۔(۲۸)

چندرا گپتا کے بعد اس کا بیٹا بندوسار Bindusara (۳۰۰۔۲۷۳ق م) اور اس کے بعد چندرا کا پوتا اشوک اعظم (۲۷۳۔۲۳۲ق م) بادشاہ بنا جو ہندوستان اور دنیا کی تاریخ کا ایک نامور بادشاہ گزرا ہے۔ اشوکا نے انتظامی اصلاحات نافذ کیں، صوبیداری نظام بہتر بنایا، صوبائی افسران کے ذیلی علاقوں میں دوروں کا اہتمام کیا اور جرائم کی روک تھام کا مضبوط انتظام کیا۔ عوام الناس کے لئے فلاح و بہبود کے بے شمار کام شروع کئے۔ اشوک اعظم بدھ مت کا پیروکار بن گیا اور پوری ریاست میں جابجا مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل کتبے نصب کروائے۔ وہ درۂ خیبر سے لے کر راس کماری تک سارے ہندوستان کا بادشاہ تھا تاہم ۱۸۵ق م کے بعد اشوکا کی یہ ترقی یافتہ سلطنت کئی حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی اور ۱۸۰ق م کے قریب تاتاری بہوچی (ہن) چینی قبائل کے بادشاہوں نے سلطنت ہند کو اپنی 'کشن' سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس خاندان کے کنشک Kanishka نے بھی بدھ مذہب اختیار کیا اور بدھ کے مجسمے ترشوا کر نصب کروائے۔ چوتھی صدی عیسوی میں کوشن خاندان کے زوال کے بعد گپتا خاندان کی سلطنت قائم ہوئی اور ۳۱۸ء سے ۶۰۰ء تک یہی خاندان برسراقتدار رہا۔(۲۹)

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت بھی روم و ایران سے کچھ کم خراب نہ تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ابتری اور گمنامی کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے جس میں برہمنیت اور طبقاتی معاشرت نے عوام الناس کو تقسیم کر کے پیس کر رکھ دیا۔(۳۰)

طلوع اسلام کے وقت ہندوستان

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان 'برہمنی مت' کے دور سے گذر رہا تھا جہاں نئے نئے مکاتب فکر جنم لے رہے تھے۔ یوگی اور سنیاسی اپنے آپ کو جسمانی اذیتوں کے ذریعے پاکیزگی اختیار کرنے کی کوشش کررہے تھے اور معاشرہ طبقاتی نظام کا شکار ہو چکا تھا۔ اسی اثناء میں سدھاتا گوتم، سکیا قوم کے شاہی خاندان میں (۵۶۰ ق م) 'کپل وستو' کی بستی میں پیدا ہوئے۔

گوتم نے ۲۸ سال کی عمر میں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جو بعد میں 'بدھ مت' کہلایا۔ گوتم بدھ کی تعلیم میں سچائی، بزرگوں کی عزت، نیک اعمال، خیرات، صبر، ضبط اور مساوات انسانی پر بہت زور دیا گیا۔ ان کے بقول عرفانِ الٰہی قلبی کیفیات اور روحانی محسوسات کی تربیت سے ملتا ہے۔، جسے 'نردان' کہتے ہیں۔ (۳۱)

بدھ نے کہا کہ مجھ سے پہلے بھی انسانوں کی راہنمائی کے لئے بدھ آتے رہے ہیں اور بعد میں بھی آئیں گے۔ مہاتما بدھ نے ذات پات کی تقسیم اور معاشرے میں موجود عدم مساوات یعنی برہمن سماج کے خلاف آواز اٹھائی اور شودروں کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کیا۔

کچھ محققین نے قرآن میں مذکور نبی، ذوالکفل (الانبیاء: ۸۵، ص: ۴۸) کو مہاتما بدھ قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہاں لفظ کفل، کپل کا معرب ہے اور ذوالکفل سے مراد کفل والا یعنی کپل وستو (میں پیدا ہونے) والا ہو سکتا ہے۔ (۳۲)

چین

تقریباً پانچ ہزار قبل مسیح میں چین کے علاقہ میں، وسط ایشیا کے میدانوں اور شمالی برفانی خطے کے قبیلوں کی شاخیں پھیلنا شروع ہوئیں، جو شکار پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے قریب، زراعت پیشہ لوگوں کی بستیاں قائم ہونا شروع ہوئیں جو بعد میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہوگئیں اور اڑھائی ہزار قبل مسیح کے قریب چین کے شمالی حصوں میں پانچ ریاستیں قائم ہوئیں ج، وبعد میں ایک بڑی متحدہ ریاست میں تبدیل ہوئیں اور 'یاؤ' پہلا چینی بادشاہ بنا۔ یاؤ کا زمانہ ۲۰۸۵ تا ۲۰۰۴ ق م ہے اس کے بعد شون Shone 'ہیئیا Haia، شانگ Shang اور اینگ کے خاندان باری باری برسر اقتدار آئے۔ ۱۰۰۰ سے ۶۰۰ ق م تک کا زمانہ چین

میں ترقی اور امن کا زمانہ ہے اس وقت چاؤ خاندان حکمران تھا۔شمالی سرحدوں پر منگولوں کے حملے شروع ہو چکے تھے اور چین کی سلطنت طوائف الملوکی کا شکار ہونا شروع ہوگئی۔(۳۳)

چھٹی صدی قبل مسیح میں کنفیوشس Confuciaus 551-476 BC نے معلم اخلاق و قانون کی حیثیت سے گمراہ چینیوں کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں شروع کیں۔ان کی تعلیمات میں بار بار خدا کا ذکر ملتا ہے جس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں خدا نے چینی عوام کی راہنمائی کے لئے منتخب کیا ہے۔کنفیوشس نے انسانوں کی قربانی والی رسم کی مذمت کی۔ان کے خیال میں انسان کی سب سے بڑی خوبی انسانیت سے محبت ہے۔وہ نوع انسانی کو ایک کنبہ قرار دیتے تھے۔ان کے بقول ''حاکم کو صرف خدا کی طرف سے ودیعت فرض کی ادائیگی'' کے طور پر حکومت کرنا چاہیے۔خدا نے حاکم کو حکومت، مستقل نہیں دی وہ اس سے اقتدار چھین بھی سکتا ہے لہذا حاکم کو چاہئے کہ وہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو اپنے سے بہتر آدمی کو اقتدار دے دے۔غرضیکہ کنفیوشس کی تعلیمات ایک مکمل معاشرتی اور سماجی ضابطۂ حیات کا نمونہ پیش کرتی ہیں، جیسا کہ مور (G.E.Moore) نے لکھا ہے:

> His common sense philosophy dealt
> oxclusively with the practical questions of
> ethics and politics .(34)

کنفوشیکس کے زیر اثر چینیوں کا عقیدہ بن گیا کہ خدا کا حکم بادشاہ کی زبانی ملتا ہے۔ان کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح تعلقات اور فرائض کی ادائیگی میں بہتری کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ان کے خیال میں آسمانی راستہ یا جنت کا راستہ، Tao ہے۔(۳۵)

چین کا پہلا واضح قانون ڈیوک آف چائنا Duke of China کو قرار دیا جاتا ہے مگر اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے کنفیوشس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ان کی اصل تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ممکن ہے کنفیوشس چین کی سرزمین پر اللہ کے مبعوث کردہ نبی ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق، چین میں طویل المدت طوائف الملوکی کے بعد ''ہان Han'' خاندان کی حکومت قائم ہوئی جن پر کنفیوشس کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ہان

خاندان کی حکومت تیسری صدی عیسوی تک قائم رہی۔۲۲۱ء میں ایک فوجی سردار نے بغاوت کر کے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا پھر اندرونی خلفشار کا دور شروع ہوا جس کا خاتمہ ۲۶۵ء میں SHE-Cheu خاندان کے اقتدار سنبھالنے سے ہوا۔ اس خاندان کی فرمانروائی چھٹی صدی عیسوی تک جاری رہی۔(۳۶)

مجموعی طور پر چین میں مطلق العنان موروثی بادشاہت کا دور دورہ رہا جس میں جزوی طور پر کبھی کبھی اچھی حکومتیں بھی قائم ہوئیں جو اپنے معاملات وزارتوں اور مشاورتوں کے ذریعے چلانے کی روادار تھیں۔ چین میں بادشاہ کو ''شہنشاہ فرزند آسمان'' کہتے تھے۔ اس کا حکم قانون تھا۔ سخت ترین بادشاہوں کے دور میں بھی سلطنت کو استحکام کم ہی نصیب ہوا۔ متعدد ریاستیں اشرافیہ کی بدترین فرمانروائی کا تختۂ مشق بنتی رہیں۔ چند گھرانے خوشحال رہتے اور عوام ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے رہتے۔ طویل عرصہ تک کے لیے خانہ جنگیاں اور بیرونی حملے امن وامان اور بہبود وترقی کی راہ میں حائل ہوتے رہے۔

چینی اپنی فوج کے لیے بھی کوئی تربیت کا بندوبست نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی جنگی قانون ترتیب دیا گیا، سوائے کنفیوشس کی تعلیمات کے ـــ وہ یہ کہ سپاہی کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کس مقصد کے لیے جنگ کر رہا ہے؟ حوصلے کا دارومدار پاکیزگی مقصد پر ہے اور ایسے لوگوں کو جنگ میں دھکیلنا جنہیں جنگ کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ جہنم میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش کے زمانہ میں چین کی سرزمین پر سوئی خاندان حکومت کر رہا تھا جن کے بادشاہ شستہ ادبی ذوق، اعلیٰ اخلاق کو پسند کرنے والے ہوتے تھے۔ چین کے لوگوں نے ۵۰۰ء میں چائے دریافت کی جبکہ مذہبی لحاظ سے وہ اس وقت مہاتما بدھ کے پیرو کار بنتے جا رہے تھے۔ ۶۱۸ء میں یعنی ہجرت نبوی ﷺ سے چار سال پہلے، سوئی خاندان کی جگہ تانگ خاندان برسر اقتدار آیا اور ان کا دور ۹۰۶ء تک جاری رہا۔

سرزمین عرب کی ریاستیں

علمائے تحقیق کا اندازہ یہ ہے کہ اس ہلال نما زرخیز خطے میں، جو صحرائے عرب کے قوس نما شمالی سرحد کے اوپر، خلیج فارس سے لے کر بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کے شمالی بازوؤں تک پھیلا ہوا

ہے۔۔۔۔ جسے دجلہ، فرات اور یردون سیراب کرتے ہیں، میں زراعت کاری کی ابتداء کوئی ۲۰ ہزار ق م سے شروع ہو چکی تھی۔ ۱۰ ہزار ق م تک زراعتی تمدن بہت ترقی کر گیا تھا جبکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے میدانوں میں شکاری انسانوں کی ٹولیاں خانہ بدوشی کا سفر کر رہی تھیں۔ اس دور کے لوگوں کا سماجی نظام، پدرسری (والد کی سربراہی والا) تھا۔ مورث اعلیٰ کے نام سے قبیلوں کو پکارا جاتا تھا۔ دجلہ وفرات کے کنارے متعدد شہر اور قصبے آباد ہو گئے، زمین تقسیم ہو گئی اور ہر شہر اپنے مضافات سمیت ایک جداگانہ ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ ولادتِ مسیح سے پہلے تیسرے ہزار سالہ دور کی لکھی ہوئی بابلی الواح کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ریاستوں میں بادشاہی نظام قائم ہو چکا تھا۔(۳۷)

مولانا ابوالکلام کے بقول: اگر عربی زبان اور اس کی ابتدائی شکلوں کے بولنے والوں کو ایک نسل تسلیم کر لیا جائے تو یہ دراصل بہت سے گروہوں اور قبیلوں کا ایک مجموعہ تھی اور عرب، فلسطین، شام، مصر اور عراق کے خطوں میں پھیلی ہوئی تھی۔(۳۸)

قرآن پاک کے بیان کی روشنی میں محققین نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل و قابیل تھے جن سے ہابیل کو قابیل نے قتل کر دیا۔ تورات کی تصریح ہے کہ بعد کے زمانے میں قابیل عدن کے مشرق میں 'نوذ' کے علاقہ میں جا بسا اور اس کی نسل سے اولاد آدم، دجلہ وفرات کے کنارے ڈیرے جمانے لگی۔ تورات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے تیسرے بیٹے شیث Shithe تھے۔(۳۹)

محققین کا خیال ہے کہ شیث کا لقب 'اغثا ذیمون' ہے اور آپ حضرت ادریسؑ کے استاد ہیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام تہذیب انسانی کے پہلے مرکز، بابل میں اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ یہی بابل یا کلدانیہ Chaladea حضرت نوحؑ کا بھی مسکن تھا اور یہیں سے ساڑھے چار ہزار قبل مسیح کے قریب وہ عالمگیر طوفان شروع ہوا تھا جس کا تذکرہ ہر قوم کی تاریخ میں ملتا ہے۔ بابلیوں کی الواح پر، جو دو ہزار سال بعد لکھی گئیں اس طوفان یا طغیانی آب کی کہانی نہایت مؤثر پیرائے میں مرقوم ہے اور طوفان سے پہلے کے بادشاہوں کی فہرستیں بھی موجود ہیں۔(۴۰)

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بقول روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفان عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں۔ حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیوگنی جیسے دور دراز

علاقوں کی پرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آباؤاجداد ایک ہی خطہ میں آباد ہوں گے جہاں یہ طوفان آیا تھا۔ (۴۱)

قوم نوح کی بربادی کے بعد سب سے پہلی جو مقتدر اور حکمران قوم ظہور پذیر ہوئی قرآن کی زبان میں اس کا نام 'عاد' ہے۔ جس کا تعلق عرب کی امم بائدہ یا برباد قوموں سے ہے۔ یہ قوم قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت بڑے حصہ پر ان کی ریاستیں تھیں۔ قرآن کے مطابق حضرت ہود علیہ السلام کو اس قوم کی طرف مبعوث کیا گیا، اس کا زمانہ ۲۲۰۰ق م سے ۱۷۰۰ق م تک ہے۔ عاد کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصہ یمن و حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی سلطنتیں ایک طرف تو بیرون عرب بابل، مصر اور دیگر ممالک میں قائم ہوئیں اور دوسری طرف اندرونِ عرب حضرموت اور سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک ۔۔۔ یہ خوشحال قوم تھی جو اونچی عمارات کی شوقین قرآن نے 'احقاف' کے نام سے ان کی سلطنتوں کا ذکر کیا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔ (۴۲)

قوم عاد کے بعد قومِ 'ثمود' کو سیاسی جانشینی حاصل ہوئی جو شمال مغربی عرب میں وادی القریٰ میں آباد تھی۔ یہ علاقہ شام اور حجاز کے مابین عربوں کی مشہور تجارتی شاہراہ پر واقع ہے جو یمن کے سواحل بحر احمر کے کنارہ حجاز و مدین سے گزر کر خلیج عقبہ کے کنارہ سے نکل کر شام کو جاتی ہے۔ ثمود دراصل عاد ثانیہ ہیں، جنہیں 'عاد ارم' بھی کہتے ہیں۔ ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو نبی مبعوث کیا گیا تھا۔ جن کے جھٹلائے جانے پر عذاب الٰہی نے انہیں پکڑ لیا۔ ان کا زمانہ ۱۸۰۰ سے ۱۶۰۰ق م تک ہے۔ پہاڑوں کا کاٹ کر عمارات بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ ثمود کے دارالحکومت کا نام حجر تھا اب اسے مدائن صالح کہتے ہیں۔ (۴۳)

عربوں کی بیرون عرب ریاستیں

سمیریہ اور بابل

طوفانِ نوح کے بعد دجلہ و فرات کی وادی کے زیریں حصے میں جس آبادی کے آثار ملتے ہیں وہ سمیری قوم کہلاتی ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے 'سرزمین جنوب کے لوگ'۔ پہلے 'کیش' کا شاہی خاندان پھر 'زیرک' شاہی خاندان ان پر حکمران ہوا۔ معروف بادشاہوں میں سارگون

(سارغن) نے دجلہ، فرات اور یردون کی وادیوں کی تمام ریاستوں کو فتح کر کے شاہی اقتدار قائم کیا اور نیا شہر 'اکاد' آباد کر کے اسے دارالخلافہ بنایا۔ ۲۱۶۹ ق م میں عرب کے بدوی قبائل کے سردار، سوقو آبوم نے بابل میں حکومت قائم کر کے پہلے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔

بابل کے پہلے شاہی خاندان کا چوتھا بادشاہ حمورابی تھا، جو ۲۰۲۷ ق م میں تخت نشین ہوا اور پہلا مقنن بادشاہ مشہور ہے۔ اس نے مثالی ملکی نظام ترتیب دیا اور تختیوں پر قانون کی دفعات لکھوا کر شہروں کے چوکوں پر نصب کرایا۔ اسی بادشاہ کے ہمعصر حضرت ابراہیم علیہ السلام (اور حضرت لوط علیہ السلام جو آپ کے بھتیجے تھے) شہر 'ار' (عراق) میں پیدا ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے عراق کے بادشاہ نمرود (Ninrod) کے سامنے بت پرستی اور ستارہ پرستی سے انکار کیا۔ ۲۰ سال کی عمر میں آپ نے حران (شرق یردون کی وادی) کی طرف ہجرت کی جب کہ حضرت لوط علیہ السلام سدوم Sodom کی طرف گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر، فلسطین اور شام بھی گئے اور مصر کے بادشاہ (فرعون) سے ملاقات کی۔ آپ کا سن ولادت ۲۱۶۰ ق م اور سن وفات ۱۹۵۸ ق م ہے۔ (۴۴)

مصر، شام اور فلسطین

قرآن میں ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ، ہجرت اور جدوجہد کے علاوہ آپ کا انسانیت کے نام پیغام، تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً نمرود وفرعون کے ساتھ آپ کا مکالمہ ومقابلہ اور ان کا ردعمل سورۂ الانبیاء اور الشعراء میں۔۔ اسی طرح لوط علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم کے سلوک اور اس پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تفصیل الانبیاء اور ہود میں ہے۔

مصر یعنی وادیٔ نیل میں ۵ ہزار قبل مسیح میں عرب قبائل کی آمد سے جس تمدن کا آغاز ہوا وہ شام، فلسطین، یہودیہ اور عرب سے آنے والے قبائل اور پرانے بدوی قبائل کے باہمی اختلاط کی پیداوار تھا۔ ان کا بادشاہ 'مینیز'، متحدہ مصر کے پہلے شاہی خاندان کا پہلا فرعون تھا۔ مخروطی شکل کی پہلی سہ پہلو عمارت، جو 'اہرام' کہلاتی ہے، فرعون 'خاصے خموئی' کے بیٹے 'نردسر' کے وزیر اعظم 'آم ہوتف' نے بنوائی۔ اس کے بعد مختلف بادشاہ اہرام بنواتے رہے جو آج عجائبات عالم میں شامل ہیں۔

فراعنہ مصر کی طویل حکمرانی کی ابتدائی صدیاں، خوشحال اور متمدن زمانہ کی بہترین مثالیں ہیں۔ منظم حکومتیں، سادہ زندگی اور ان کا عقیدۂ آخرت، اس تہذیب کے نمایاں پہلو ہیں۔ وہ مردوں کے لیے پختہ قبریں بناتے جب کہ خود امراء اور بادشاہ تک مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں رہتے۔

دو ہزار سال قبل مسیح میں 'مینطو ھوطب' نے مصر کی سلطنت کو از سر نو منظم کر کے انتظام و انصرام بہتر انداز میں آگے بڑھایا۔ کچھ سالوں کے امن کے بدامنی کا دور شروع ہو گیا جس میں ریاست کے مختلف حصوں میں عرب، چرواہے قبائل کی یلغار ہوتی رہی اور وہ آخر کار کچھ علاقوں میں قابض ہو گئے۔(۴۵)

یہی لوگ بعد میں چرواہے بادشاہ Hyksos کے نام سے مصر میں حکمران بھی رہے (جو شام میں 'عمالیق' یا 'عمالقہ' تھے) علون بن سان (پہلے فرعون) کے دور میں ابراہیم علیہ السلام مصر گئے۔ Hyksos میں 'ہیک' کا سابقہ (اگر ہم اسے 'شیخ' کا محرف نہ سمجھیں، جو عربی میں امیر کے لئے استعمال ہوتا ہے) مصری مؤرخ مانیشو کے مطابق خالص مصری لفظ ہے۔ 'سوس' کا لفظ عربی ہے جس کے معنی نگرانی و انتظام کے ہیں۔ اسی مناسبت سے چرواہے کو بھی ابتداء میں سوس کہا گیا اور یہ لفظ گلہ بانی کے معانی سے جہاں بانی کے معانی تک وسیع ہو گیا۔ یہاں تک کہ عربی لفظ 'سیاسیۃ' کا مآخذ یہی 'سوس' ہے۔ ہمارے ہاں یہی لفظ گلہ بانی و چوبانی کے معنوں میں 'سیس' یا 'سائس' کے طور پر مستعمل ہے۔ فراعنہ کے آخری بادشاہ کا نام 'ایئس' تھا، جس کے قرآن مجید نے 'عزیز مصر' کے نام سے پکارا ہے۔(۴۶)

اسی عزیز مصر کے دور میں نبی یوسفؑ (بن یعقوبؑ بن ابراہیمؑ) کے غلام اور پھر بادشاہ بننے کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ قرآن اور تورات میں تفصیلات موجود ہیں، جنکی روشنی میں مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ اس دور کے بادشاہ کا نام ریان بن ولید تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی قابلیت و صلاحیت اور پارسائی سے متاثر ہوا۔ آپ وزیر خزانہ اور بعد میں وزیر اعظم اور بادشاہ کے مرتبے پر فائز ہوئے۔

یوسف نے مصر کو قحط سے بچانے کے لئے منصوبہ بندی کی جو کامیاب رہی اور یوں مصر کی سلطنت ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ اسی دور میں آپ کے والد یعقوب علیہ السلام، جنکا لقب

اسرائیل تھا، بھی کنعان سے ہجرت کر کے مصر آئے اور اس طرح بنی اسرائیل (یعقوب علیہ السلام کی اولاد) کا مسکن بھی یہی ملک ٹھہرا۔(۴۷)

• ۱۵۸۰ ق م میں چرواہے بادشاہوں کی جگہ نئے خاندان شاہی نے لی اور توسیع پسند بادشاہ 'تاثمین' نے سلطنت کو وسعت دی۔ 'ایمن حوطب' چہارم نے سورج دیوتا کی پوجا کا مذہب عام کیا اور اپنے آپ کو سورج کا اوتار یعنی 'فرعون' کے لقب سے روشناس کروایا۔(۴۸)

رعمسیس ثانی کے دور میں موسیٰ علیہ السلام (اور آپ کے بھائی ہارون علیہ السلام) قوم بنی اسرائیل جو اسوقت اسیرانِ فراعنہ مصر تھے، کی طرف نبی بن کر آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نکال کر وادیٔ سینا میں لا بسایا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ دنیا کے پہلے واضع قانون ہیں۔ اس کا ثبوت آپ کے 'احکام عشرہ Ten Commandments' ہیں۔

آپ نے کوہِ سینا کے بیابان میں اپنی قوم کی مردم شماری کروائی (شاید دنیا میں پہلی دفعہ) پھر ان کے گھرانوں کو الگ الگ گروہوں میں منظم کر کے ان کے سردار مقرر کئے اور ریاستی و سیاسی نظام قائم کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی مصر میں بنی اسرائیل کے ہاں پیدائش، فرعونِ وقت کے گھر میں آپ کی پرورش، آپ کے معجزات اور فرعون کے ساتھ مکالمہ و مقابلہ کی تفصیل قرآن نے سورہ القصص، المومن اور طٰہٰ میں بیان کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر تاریخ نے محفوظ کیا ہے، ایک رعمسیس ثانی، جس کے زمانے میں آپ پیدا ہوئے اور پرورش پائی اور دوسرا منفتہ یا منفتاح جس کے زمانہ میں آپ نے دعوتِ اسلام پیش کی اور قوم بنی اسرائیل کو آزاد کروا کے منظم کیا۔(۴۹)

مصریوں سے آزادی ملی تو کئی سال تک، مشرقِ وسطیٰ کی خاک چھاننے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین اور کنعان کی سرزمین میں ایک نئی شاہی ریاست قائم کی۔ ان کے حکمران 'قاضی' کہلاتے، جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی پابندی کرتے۔ انہوں نے ساؤل یا طالوت کو اپنا بادشاہ بنایا جس نے فوج منظم کی اور دیگر قوموں سے جنگیں شروع کیں۔

قرآن حکیم اور تورات کی بیان کردہ تفصیلات کے مطابق، طالوت کے بعد یہودیوں کے بادشاہ داؤد بنے۔ جنہوں نے ایک مضبوط ریاست کی بنیاد ڈالی جس کا مرکز یروشلم تھا۔ ان کے جانشین ان کے بیٹے سلیمان علیہ السلام (۹۶۰ ق م) ہوئے۔ سلیمان کا عہد فلسطین کی ریاست

خوشحال زمانہ ہے۔ سلیمان نے معبد 'ہیکل سلیمانی' تعمیر کیا اور حجاز، یمن اور عدن تک سلطنت کو وسیع کر کے سبا کی ریاست کو زیر نگیں کیا۔ داؤدؑ اور سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ حضرت داؤد کو الہامی کتاب 'زبـــــور' عطا ہوئی۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔(۵۰)

اہل عرب کی اندرون عرب ریاستیں

مئورخین کے بیان کیمطابق، قدیم زمانہ تاریخ کے عربوں کو دو بڑے صاحبانِ اقتدار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک بنی عدنان جنہوں نے بحر احمر کے عربی ساحل اور مصری ساحل پر فتوحات حاصل کیں، عراق وشام میں حکومت کی اور کریٹ Crete (یونانی ریاست) موصل اور روم کے علاقوں تک پھیل گئے۔ دوسرے بنو قحطان، جنہوں نے ایک طرف یمن میں معینی سلطنت (بحر روم کے کنارے بحر عرب اور خلیج فارس تک) اور مملکت سبا جو سلطنت حمیر کے بعد قائم ہوئی اور دوسری طرف یمن سے نکل کر عرب کے دوسرے علاقوں میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ ان میں سے بنو غسان نے شام میں اقتدار سنبھالا، شہر بسائے، محل تعمیر کئے اور حوران میں بصری کو دارالحکومت بنایا۔ یہ ریاست شام، تدمیر، فلسطین اور لبنان پر حاوی تھی۔(۵۱)

چھٹی صدی عیسوی کی ابتداء سے ربع صدی تک مشرق ومغرب میں مجوسیت وعیسائیت (ایران وروم) کی جنگیں جاری رہیں۔ اس دوران غسانی حکومت رومیوں کی زیر نگرانی تھی۔ روم سے ان کے بادشاہ نامزد کئے جاتے تھے۔ ان کے حکمران فروہ بن عمر بن الفاخرہ کے پاس جناب رسول کریم ﷺ کا گرامی نامہ پہنچا اور اس نے اسلام قبول کر لیا جب کہ قیصر روم نے اسے گرفتار کر کے فلسطین میں مصلوب کروادیا۔

قبیلہ لخم کے خاندان آل نصر نے ریاست حیرہ، عجم کے پہلو میں قائم کی۔ شہر حیرہ موجودہ کوفہ سے تین میل دور اس علاقے میں واقع تھا جہاں آج کل نجف ہے، بلند وبالا محلات، اس کی تمدنی عظمت کی نشانی کے طور پر قائم تھے۔ آلِ منذر کی موروثی حکومت، سلطنت فارس کے ماتحت، عرب وایران کے درمیان تھی (Buffer State کے طور پر)۔ اسی خاندان کے حکمران عمرو بن المنذر کے دور حکومت میں جناب رسول اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی۔(۵۲)

اس خاندان کا آخری حکمران نعمان بن منذر تھا جسے خسرو پرویز نے قتل کر کے ان کا اقتدار ختم کر دیا۔ معینی سلطنت جنوبی عربستان میں تھی جس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے۔ سبائی اور معینی ہمعصر ہیں۔ سبائی دور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو برس قبل ہے۔ اس سلطنت کا پایۂ تخت مآرب تھا۔ قریباً ۱۱۵ ق م میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا اور مآرب کو پایۂ تخت بنالیا۔ (۵۳)

بنی کہلان کی نسل نے بحرین سے حضرموت پہنچ کر کندہ کے مقام پر ریاست قائم کی جو ریاست حمیر کے ساتھ جنگوں میں امراء القیس، شاعر بادشاہ کے دور حکومت میں پارہ پارہ ہوگئی۔ اسی خاندان کے حکمران وائل بن حجر، بنو کندہ کے وفد کے ساتھ ۱۰ھ میں جناب رسولِ کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ وائل کو حضرموت کی حکومت کا فرمان حضور ﷺ کیطرف سے عطا کیا گیا۔ (۵۴)

بنو قضاعہ کی ایک ریاست جس کی باگ ڈور، کلب بن ویرہ کے پاس تھی، کے دو مقامات دومۃ الجندل اور تبوک کے لوگوں نے نصرانیت اختیار کرلی تھی۔ اسلامی ریاست کے قیام کے وقت دومۃ الجندل کا حکمران اکیدر بن عبدالملک تھا جو ملوک تبابعہ میں سے تھا۔ عہد نبوی میں خالد بن ولید کے ہاتھوں گرفتار ہوکر جناب رسول خدا ﷺ کے سامنے پیش ہوا۔ (۵۵)

یمن کی ریاست

یمن کی تاریخ انتہائی طویل ہے، یہ علاقہ بڑی بڑی تہذیبوں کا گہوارہ اور حکومت و سیاست کا مرکز رہا ہے۔ پہلے مرحلہ میں دولت معینیہ قائم ہوئی پھر سبائیہ (۸۵۰ تا ۱۱۵ ق م) اور تیسرے مرحلہ میں دولت حمیریہ (۱۱۵ ق م سے ۵۲۵ء تک)۔ سلاطین حمیر میں سے بعض عیسائی اور اکثر یہودی المذہب تھے۔ انہیں عرب مؤرخین 'تبابعہ' کہتے ہیں۔ (۵٦)

تبابعہ، تبع کی جمع ہے۔ حبشی زبان میں اس کے معانی قادر و جبار اور صاحب قوت کے ہیں۔ قرآن کی سورہ الدخان اور سورہ ق میں ان کے زور و قوت کی طرف اشارہ موجود ہے۔

حمیر کا آخری بادشاہ 'ذوالنواس' یہودیت کے تعصب میں دیوانہ ہوکر نجران پر چڑھ دوڑا۔ عیسائیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے۔ بڑے بڑے گڑھے کھدوا کر ان میں اس نے

آ گ دہکائی ۔جو عیسائی یہودیت قبول نہ کرتا اسے ان گڑھوں میں نذر آتش کردیا جاتا۔قرآن میں اصحاب الاخدود کا اشارہ اسی ظالم حکمران کی طرف ہے۔(۵۷)

اس ظالمانہ حرکت کے ردعمل میں عیسائیوں نے نجاشی، شاہ حبشہ کے ہاں فریاد کی جس نے قیصر روم کے اشارہ پر یمن میں فوج کشی کی اور ۵۲۵ء میں یمن فتح ہوگیا۔یمن کے فاتح پہلے حبشی حکمران 'ارباط' کو عیسائی سپہ سالار'ابرہہ' نے قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

ابرہہ اقتدار کے نشے میں چور تھا اور کعبہ کے مرکز ہونے پر سیخ پا بھی۔اس نے ہاتھیوں کی فوج لے کر خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے ارادہ سے مکہ پر چڑھائی کی یہ ۵۶۹ء یا ۵۷۱ء کا واقعہ ہے۔ایک خدائی معجزہ نے کعبہ کی حفاظت کی اور ابرہہ کو ناکامی و نامرادی کا سامنا کچھ اس صورت میں ہوا کہ اس کے ہاتھی پسپا ہوتے ہوتے اپنی ہی فوج کو روندتے گئے۔قرآن نے سورۃ الفیل میں بیان کیا ہے کہ ہاتھیوں کے لشکر پر پرندوں کے جھنڈ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پتھر کی کنکریاں گرائیں اور یوں ابرہہ کا لشکر نیست و نابود ہوگیا۔عرب کی تاریخ میں اس حملے کے سال کو 'عام الفیل' کہا جاتا ہے۔نبی آخرالزماں جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت مبارک کا یہی سال ہے۔

یمن میں بادشاہت موروثی رہی اور بادشاہ کا حکم قانون ۔۔۔ سکے جاری کئے جاتے جن پر بادشاہ کی تصویر کندہ ہوتی۔معاشرہ چار عناصر، فوجی، کسان، صناع اور تجار سے مرکب تھا۔ان میں سے ہر طبقہ کے حقوق و فرائض متعین تھے۔اہل یمن تمدن و معاشرت اور تجارت وصنعت کے میدانوں میں دیگر عربوں سے کہیں آگے تھے۔محلات، قلعے، معابد اور ہیکل کے مالک، ریشم اور حریر و دیبا کے قیمتی ملبوسات اور کھانے میں میوہ جات اور مرغن غذاؤں کے شوقین تھے۔(۵۸)

مکہ کی شہری ریاست ۔۔۔ ایک تعارف

جغرافیائی طور پر ناف زمین پر آباد پرانی دنیا کے بیچوں بیچ تین براعظموں کے وسط میں واقع، عرب کی شہری ریاست مکہ، بکہ یا ام القریٰ ۔۔۔ سطح آب سے ۳۳۰ میٹر بلند، چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھری، شرقاً غرباً تین کلومیٹر، جنوباً شمالاً ڈیڑھ کلومیٹر ہے۔یہ بستی حضرت مسیح سے دو ہزار برس قبل حضرت ابراہیم کے ہاتھوں آباد ہوئی، جب انہوں نے اپنے معصوم بیٹے اسماعیل کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھائیں۔(۵۹)

فلپ حتی نے بھی 'مکہ' کو سبائی لفظ 'مکورابہ' سے ماخوذ قرار دیا ہے جس کے معنی مقدس جگہ کے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ اس شہر کی بنیاد ہی مذہب سے وابستہ ہے۔اس شہر کے باسیوں کی محنت نے اسے ایک دولتمند شہری ریاست بنادیا تھا:

The commercially minded and progressive Makkans soon rendered their city a centre of wealth.(60)

بنو اسماعیل کے قصی بن کلاب اس شہری مملکت کے ۴۴۰ء میں بادشاہ بنے تو اس کی تعمیر جدید کر کے منظم ریاست میں تبدیل کر دیا۔اس کی حیثیت ایک شہر جمہوریت کی تھی۔یونان کے شہر ایتھنز اور اسپارٹا کے طرز حکومت کا ایک منظم خاکہ قریش کی سرزمین میں نظر آتا ہے۔(٦١)

امارت مکہ کی بنیاد مندرجہ ذیل محکموں پر تھی:

١۔امارتِ مکہ :قبائلی طرز کی بے قید ریاست

٢۔دار الندوہ :قبائلی مجلسِ شوریٰ ٣۔حجابت :بیت اللہ پر غلاف چڑھانا

۴۔لواء :سپہ سالاری ٥۔سقایہ :زائرین حرم کو آب زم زم سے سیراب کرنے کی ذمہ داری ٦۔رفادہ :مہمانوں کی میزبانی اور اس کا محصول۔(٦٢)

دارالندوہ (ندی سے ماٴخوذ معنی قوم۔مشاورت کی جگہ (پارلیمنٹ) اور معاشرتی و سماجی زندگی کا مرکزی شعبہ تھا۔اس ادارے کی رکنیت چالیس سال کے عمر کے شہری کو ملتی۔قصی بن کلاب کے بعد اس ریاست میں اعیانیت قائم ہوئی اور مختلف قبائل کے ذمہ مختلف شعبہ ہائے زندگی آئے۔بنو ہاشم (جناب رسول پاک ﷺ کا خاندان) امارتِ مکہ میں خارجی تعلقات کے ذمہ دار تھے۔

قبائل کے سردار 'شیخ' کہلاتے۔قبائل کا نظام مشاورت اور تقسیم اختیارات پر مبنی تھا۔ہر قبیلہ میں ہر دس آدمیوں پر ایک عریف (محلے کا منتظم) ایک سو آدمی پر ایک نقیب (منادی کر کے مجالس منعقد کروانے والا) پر قبیلے کا رائد (زمین اور آبپاشی کا منتظم) خطیب، شاعر نساب (نسب کا ریکارڈ رکھنے والا) اور منصف۔(٦٣)

ہر قبیلہ کی آبادی میں 'نادی' مجلس مشاورت تھی، جو اس آبادی کے جملہ معاملات کی

ذمہ دار تھی۔ موالی اور حلیف بننے کا طریقہ رائج تھا۔ کسی قبیلہ کے خلاف کوئی بیرونی حاکم اصولی طور پر کسی طرح کا اختیارِ سماعت نہ رکھتا تھا۔ اہل عرب کی اجتماعی، سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں کے مرکز 'اسواق' (بازار، میلے) تھے جو مختلف مقامات پر ہر سال لگا کرتے تھے۔ یہ آپس کے معاملات طے کرنے، مقدمات کے فیصلے کرنے، صلاحیتوں کا اظہار کرنے اور خرید وفروخت کا عظیم الشان مرکز ہوتے۔

آبادی شہری (حضری) اور دیہاتی (بدوی) طبقوں میں منقسم تھی۔ مکہ کا مذہبی نظام سدانہ (معبد کی رکھوالی) حجابہ (معبد کی دربانی) سقایہ (حج وعمرہ کے لئے آنے والوں کو پانی پلانا) عمارۃ البیت (عام انتظام کعبہ)۔۔۔ کے کئی شعبہ جات پر مشتمل تھا۔ اس کے ذیلی ادارے بھی تھے جو تمام مذہبی امور کے معاون وراہنما اور ذمہ دار تھے۔ حج کے لیے آنے والوں کو ایک سالانہ محصول ادا کرنا پڑتا جس کے بدلے میں ان کے لئے قیام وطعام کا بندوبست کیا جاتا۔ میلوں میں 'عشر' وصول کیا جاتا۔ اسی طرح قومی معبد (خانہ کعبہ) پر جو چڑھاوے چڑھائے جاتے ان کی حفاظت پر الگ شعبہ کام معمور تھا۔ زائرین کعبہ کو کپڑوں کا جوڑا، قربانی کا جانور اور دیگر ضروریات، معاوضے کی ادائیگی کی صورت میں میسر آتی تھیں اور یہ ریاست یا بلدیہ کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا، گویا مالیات کا نظام اس طرح چلتا۔ (۶۴)

نظام عدل کے بنیادی طور پر ذمہ دار دو شعبہ جات 'اشناق' (جرمانے وغیرہ کی وصولی) اور 'حکومہ' (عدالتی امور) تھے۔ ان کے ساتھ 'حلف الصلاح' کے نام سے ایک جماعت امن وامان کی ذمہ دار تھی۔ بعد میں 'حلف الفضول' کے نام سے ایک وسیع تر معاہدہ ہوا (جس میں جناب نبی کریم ﷺ ۲۵ سال کی عمر میں شامل ہوئے) جو رضا کارانہ فلاحِ عامہ اور مظلوموں کی دادرسی کا کام انجام دینے کی غرض سے قائم رہا۔ نظام سفارت کے لئے الگ شعبے کام کر رہے تھے جبکہ دفاع کا نظام بھی تفصیلی منصوبہ بندی کے ساتھ مرتب ومنظم تھا۔ (۶۵)

اسلام سے پہلے مکہ والوں میں مذہبی وحدت نہیں تھی۔ کوئی مقدس کتاب یعنی تحریری قانون بھی نہیں تھا۔ بت پرست، مشرک، ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے والے، دہریے اور لا مذہب بھی پائے جاتے۔ اس کے علاوہ مجوسی، یہودی اور عیسائی مذہب کے ماننے والے بھی موجود تھے۔ بہر حال وہاں کے عوام تمدن کے اس درجے تک پہنچ چکے تھے کہ ایک مشترک اور سب سے

بڑے خدا کو بھی مانیں جو چھوٹے چھوٹے قبائلی دیوتاؤں سے بھی بزرگ تر ہو۔اس کو وہ اللہ کے پاک نام سے پکارتے تھے۔

یہ تھا مکہ کی سرزمین اور اسکے اردگرد کا سیاسی نقشہ۔عرب وعجم کے اس سیاسی اور سماجی ماحول میں اللہ کے آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ نے ۶۱۰ء میں اعلان نبوت فرمایا اور ربع صدی کی جاں گسل تگ ودو کے بعد، مدینۃ النبی میں دنیا کی وہ پہلی اسلامی ریاست قائم کی جسے بعد میں تا قیامت ایک مثال بننا تھا۔رسول اللہ کی مکی زندگی کا حال ہمارے موضوع کا حصہ نہیں لھٰذا ہم آئندہ صفحات میں آپ ﷺ کی قائم کردہ ریاست کے خدوخال کا تاریخی اور تحقیقی مطالعہ پیش کریں گے۔

حوالہ جات وحواشی

1. Will Durant, *Caesar And Christ* : 11

۲۔ مرتضیٰ احمد خاں، تاریخ اقوام عالم: ۸۷۔۲۸۳

3. Robert Briffault, *The Making of Humanity*: 159,

4-5.Will Durant, *Ibid* , p: 383,84,85.

۶،۷،۸۔ مرتضیٰ احمد خاں، ایضاً: ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۰۹۔۳۱۰،

۹۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن: ۲/۴۰۰۔۴۱۰

10. Olmstead, *History of The Persian Emire* : 21,22

جمیل احمد، انبیائے قرآن: ۳/۵۲۴۔۵۴۰

۱۱۔ سید مودودی، تفہیم القرآن : ۳/۴۳، ۴۴، الانبیاء: ۹۶، الکہف: ۸۳۔۹۰، ۹۲۔۹۸

۱۲۔ مرتضیٰ احمد خاں، ایضاً: ۵۳۴، ۱۳۔ بائبل، آستر: ۱/۲۴۶، ۲۸۶

14. Olmstead, *Ibid*, p: 195

۱۵۔ حمید اللہ، خطبات بہاولپور: ۲،

۱۶۔ الکہف:۹۳، جمیل احمد، ایضاً: ۵۷۶،۵۴۵/۶

۱۷۔ مرتضیٰ احمد خاں، ایضاً: ۳۲۰،

۱۸۔ انقلابات عالم: ۳۲

۱۹تا۲۱۔ابن جریر، تاریخ طبری: ۲۳۲،۲۳۰/۲

22. Gibbon: 5/xL, 111, Sykes, *History of Persia*: 1/429.
Ford, *Byzantine Empire* : 100

۲۳۔ حمید اللہ، خطبات بہاولپور: ۴،

24. Luigi Parat, *History of Mankind* : 4

25. Jawaharlal Nehru, *Glimpses of World History*: 25

۲۶۔ سید مودودی، الجہاد فی الاسلام: ۳۲۲

27. Nehru, *Ibid* p:27,28

مرتضیٰ احمد خاں، ایضاً: ۲۹۷،۲۰۵

28,29.Nehru, *Ibid*. p: 29-30

30. Mukerji, *History of India*: 335

۳۱۔ مرتضیٰ احمد خاں، ایضاً: ۳۶۴، ۳۶۶،

۳۲۔ جمیل احمد، ایضاً: ۲۰۰، ۲۰۱، حمید اللہ، ایضاً

33. *Encyclopaedia Britanica,* vol: 5, p:523,524

34. G.E.Moore,History of Religions:34,35

۳۵۔ صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی۔ مشرق ومغرب: ۴۴۰
ابوسعید بزمی، تاریخ انقلابات عالم: ۹۲/۱

36. *Encyclopaedia Britanica,* vol: 5,p:525,526

37. Philip K. Hitti, *History of the Arabs*: 10

۳۸۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن: ۲/ ۲۱۷،

۳۹۔ المائدہ: ۳۰، ۳۱

۴۰۔ تورات، کتاب پیدائش: ۲۳-۱۷/۴،

۴۱۔ سید مودودی، تفہیم القرآن: ۴۴/۲

۴۲،۴۳۔الشعراء: ۱۲۸،۱۲۹، القمر: ۱۹-۲۱، الاعراف: ۶۵ حم سجدہ: ۱۷
سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن: ۲، ۴۴۔جمیل احمد، ایضاً: ۱۶۷/۱،

۴۵،۴۶۔مرتضیٰ احمد خاں، ایضاً:۱۶۴،۱۶۵، یوسف: ۳۰

۴۷۔ سلیمان ندوی، ایضاً: ۱۵۰/۱، تورات، کتاب پیدائش:باب۔۴۰-۵۰

۴۸۔ جمیل احمد، ایضاً: ۳۲۸/۱، تورات، اخراج: باب ۱۶-۲۲، بائبل، اخراج:
باب۔۱۶-۲۱

۴۹۔ سید مودودی، تفہیم القرآن: ۶۳/۱، البقرة: ۲۴۹، تورات، سیموئل، اول: باب۸،۹

۵۰۔ ص: ۲۶، النمل: ۱۶، بنی اسرائیل: ۵۵، النساء: ۱۶۳،

۵۱۔ مرتضیٰ احمد، ایضاً: ۲۲۲-۲۲۵،

۵۲۔ ابن جریر، ایضاً: ۱۰۴/۲، ابن اثیر، الکامل: ۲۵۸/۱

۵۳۔ شبلی ندوی، سیرۃ النبیؐ: ۱۱۰/۱، ۱۱۱،

۵۴۔ حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت: ۷۵،۷۶

۵۵۔ ابن خلدون، تاریخ: ۲۷/۲،

۵۶۔ ابن ہشام: ۳۷/۱،

۵۷۔ البروج: ۴-۶،

58. Philip K. Hitti, *Ibid*,p: 64

۵۹۔ حمید اللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی: ۲۷،
سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن: ۹۷/۲، ۹۸، ۱۰۴، ال عمران: ۱۱۰ البقرة: ۱۵، الحج: ۴

60. Philip K. Hitti, *Ibid*,p: 103,104

61. William Muir, *Life of Muhammad* 1/cci

۶۲۔ ابن ہشام: ۱۳۱/۱، ۲۳۱،

۶۳۔ابن سعد، طبقات : ۴۵/۱، حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی: ۲۳۶-۲۴۵

۶۴۔ المسعودی، التنبیہ والاشراف: ۲۷۹، ۲۸۰،

البلاذری، انساب الاشراف: ۱/۵۷، حمیداللہ، ایضاً: ۶۳۔۷۴

باب سوم

رسولؐ خدا کا انتظام ریاست

نبوت کے تیرھویں سال، رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کی۔ یہ ہجرت بظاہر، قریش مکہ کی طرف سے جاری، ظالمانہ اقدام سے بچاؤ کا ایک مرحلہ معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔مگر، گہری نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ دراصل یہ قدم رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی کا نہایت اہم حصہ تھا۔ سیاست و سماج کے بنیادی اصولوں کی بنیاد پر پرکھا جائے تو ہجرت مدینہ محض مجبوری کا ایک قدم نظر نہیں آتا بلکہ دوررس اثرات کا حامل ایسا منصوبہ معلوم ہوتا ہے جسے سوچ سمجھ کر عمل میں لایا گیا ہو۔

اس خیال کو مزید تقویت اسوقت ملتی ہے جب ہم ریاست مدینہ کے قیام واستحکام کے دس سالہ دور کا تحقیقی مطالعہ کرتے ہیں، جسکی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے ہجرت نبویؐ کے نتائج کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس قدم کے اٹھ جانے سے ایک طرف تو منتشر اور پریشان حال مسلمانوں کو ایک مرکز میسر آ گیا اور دوسری طرف اہم جنگی حکمت عملی ترتیب پا گئی۔ اگر مکہ ہی میں، قریش کے ساتھ دو بدو کشمکش شروع ہو جاتی تو مخلوط مذہبی معاشرے میں وہ ایک خانہ جنگی شمار ہوتی۔ الگ ریاست کے قیام کے بعد جب جہاد کی اجازت مل گئی تو رسول خدا ﷺ کے لیے، شریعت اور امت کی حفاظت آسان ہوگئی۔ امت مسلمہ اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ماحول اور فضا میسر آگئی، جس کے لیے رسول خدا ﷺ جدو جہد فرما رہے تھے۔

قرآن حکیم اور سیرت طیبہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ سارا عمل قرآنی ہدایات اور آپ ﷺ کی اپنی تمناؤں کے مطابق ہوا۔ احادیث مبارکہ سے آپ کا خواب میں ہجرت دیکھنا

ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ روانگی سے تین دن قبل آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کو ان کے گھر جا کر خوشی سے بتایا کہ ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔(۱)

اس حوالے سے دیگر حقائق کے علاوہ سورہ مزمل کا پہلا رکوع، جسکا نزول ابتدائی مکی دور کا ہے، قابل غور ہے۔ اسمیں ایک طرف تو رسول خدا کے اپنے رب کیساتھ ربط وتعلق اور قربت کی مضبوطی پر زور دیا گیا ہے دوسری طرف اہل مکہ کو انکے حال پر چھوڑنے اور انکے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے اور یہ ضمانت دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کو ایذاء دینے والوں کا بندوبست، اللہ تعالیٰ خود کر لے گا۔ آپؐ کے لیے یہ ہدایت موجود ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کام کے لیے، آپ مکہ کی سرزمین اور اہل مکہ کے محتاج نہیں ہیں بلکہ آپ کی وکیل ایسی ہستی ہے جو مشرق ومغرب اور زمین کی ساری وسعتوں کی مالک ہے۔ آپ اسی کو اپنا سہارا بنائیں، ضروری نہیں کہ اسی خطہ ارضی میں محدود رہیں، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جب آپ کے لیے موزوں ہو، اچھے طریقے سے ان لوگوں سے رخصت ہو جائیں:

ربّ المشرق والمغرب لا الٰہ الّا ھو فاتّخذہ وکیلاً ہ واصبر علیٰ مایقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً ہ وذرنی والمکذّبین اولی النّعمۃ ومھّلھم قلیلاً ہ

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ کے لیے ہجرت کرنے اور نئی دنیا بسانے کی ہدایت پہلے سے موجود تھی اور اسی کی عملی شکل مدینہ کی ریاست کی شکل میں سامنے آئی۔

اس سلسلہ میں معروف محقق ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی وہ رائے ہمارے اس تجزیے کی تصدیق کرتی ہے جو انہوں نے لفظ ہجرت کا مفہوم متعین کرنے میں پیش کی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق ہجرت کا لفظ 'ھجر' سے ماخوذ ہے جس کے معنی حبشی اور بعض دیگر سامی زبانوں، بلکہ خود قدیم عربی میں بھی شہر بسانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے معنی ابتداء سے ہی 'کسی بستی اور شہر میں جا کر آباد ہونا' کے تھے۔ سیرۃ النبی ﷺ اور خلافت راشدہ کے سلسلہ میں جہاں بھی ہجرت کا لفظ استعمال ہوا اسکے معنی نو مسلموں کا اسلامی علاقے میں آ کر اکٹھا ہونا اور مفتوحہ علاقوں میں مسلم آبادکاروں کا لے جا کر بسانا، ہوا کرتا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہجرت مدینہ در اصل مسلمانوں کی نو آبادکاری کا عظیم منصوبہ تھی۔(۲)

رسول اللہ کی آمد سے قبل، قبائل کی تقسیم در تقسیم، اور اقتدار کی طویل کشمکش کیوجہ سے یثرب میں بدامنی جاری تھی۔ ایسی صورت حال میں رسول اللہ ﷺ اس شہر کے مضافاتی قریہ، قبا میں آکے ٹھہرے، جہاں اوس اور خزرج کے بہت سے قبائل آباد تھے جو ہجرت سے قبل بیعت عقبہ کی صورت میں آپ کیساتھ، نصرت اسلام کا عہد باندھ چکے تھے، اور آپکی آمد کے منتظر تھے۔

قبا میں آپؐ نے اسلام کی پہلی مسجد تعمیر کی اور اپنی آمد کے چوتھے روز یثرب کے تمام مسلمانوں (یعنی انصار) کو طلب فرمایا۔ وہ مسلمان جو ہتھیار سجائے ہوئے حاضر خدمت ہوئے ان کی کل تعداد ایک سو تھی۔ (۳) دو ہفتے قیام کے بعد، آپ شہر یثرب کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں محلہ بنی سالم میں آپ نے سب سے پہلی نماز جمعہ ادا کی۔ قبا سے یثرب تک راہ میں دونوں طرف، انصار قطاروں کی صورت میں کھڑے، آپ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ شہر میں پہنچ کر آپؐ نے حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مکان میں رہائش اختیار کی۔

مدینہ، ہجرت نبوی ﷺ سے قبل 'یثرب' کے نام سے معروف تھا۔ (یثرب بن قاید، پہلے آبادکار کے نام پر)۔ ہجرت کے بعد اس کا نام 'مدینة النبی ﷺ' مشہور ہوگیا۔ اس عربی ترکیب کے معنی 'نبی کا شہر' ہیں۔ ایک معروف مغربی محقق کے مطابق مدینہ آرامی زبان کے لفظ *Mandita* سے مشتق ہے۔ (۴) یہ لفظ لاطینی سے ہوتا ہوا، انگریزی زبان میں Mandate کے طور پر استعمال ہوا، اسی سے لفظ Mandated Territory بنا ہے، جس کے معنی ہیں، کسی کی عملداری یا دائرہ اختیار میں شامل علاقہ یعنی *Area of Jurisdiction*۔ لہذا 'مدینة النبی' کا مطلب ہوا 'نبی کے زیر نگیں علاقہ'۔

معروف عیسائی مصنف فلپ حتی (Philip K. Hitti) کے بقول، یثرب میں آپؐ کا استقبال، بطور ایک معزز سربراہ *"As an honoured chief"* کے ہوا۔ (۵)

دیگر حقائق بھی شاہد ہیں کہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ ایک مہاجر کے طور پر نہیں آئے تھے بلکہ آپ کی آمد ایک فرمانروا کی آمد تھی۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے الفاظ واضح ہیں کہ آپ نے اہل یثرب سے عہد لیا تھا کہ وہ آپ کی اطاعت کریں گے۔ اللہ کے دین کے لئے ہر حال میں کام کریں گے اور رسول خدا ﷺ کی حفاظت کریں گے۔ (۶) اسی طرح ہجرت سے پہلے نازل ہونے والی آیات میں آپ کو اقتدار اور ریاست کے حصول کی دعا سکھائی گئی تھی:

و قل رب أدخلني مدخل صدق و اخرجني مخرج صدق و اجعل لي من لدنك

سلطٰنا نصیرا ٥ (الاسراء : ۸۰)

تاریخ سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ کا استقبال کرنے والی بچیوں تک کو یہ بات معلوم تھی کہ آپ اللہ کے نبی اور مطاع وفرماں روا کے طور پر تشریف لا رہے تھے:

أیها المبعوث فینا جئت بالأمر المطاع ۔(۷)

ان حقائق سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ مکہ سے رسولؐ خدا کی ہجرت مستقبل کے منصوبہ بندی کے بغیر نہیں تھی اور آپؐ کی یثرب میں آمد دراصل مسلمانوں کی نوآبادکاری اور اسلامی ریاست کے قیام میں سب سے اہم سنگ میل تھی جس کی بنیادیں بیعت عقبہ کے معاہدے میں رکھ دی گئی تھیں۔ یثرب کے قبائل میں سے اہم ترین قیادت نے نئی ریاست کے قیام کے لیے آپ کی سربراہی پر صاد کیا تھا لھذا آپؐ نے ہجرت کے مقاصد کو مدینہ کی اسلامی ریاست کی تعمیر اور امت مسلمہ کی تشکیل کی صورت میں حاصل کرلیا۔

اسی لیے آپ کا شایان شان استقبال کیا گیا اور اسی بنیاد پر یثرب کا نام مدینۃ النبیؐ مشہور ہوا۔۔۔ یہ شہر نبیؐ دراصل ایسی شہری ریاست تھی جس کا انتظام نبی آخرالزماں کی سربراہی میں ترتیب پایا جو بذات خود تاریخ انسانی کا ایک انوکھا، منفرد اور مثالی واقعہ قرار پاتا ہے کہ رسول آخرالزماں ایک ریاست کی تشکیل اور تعمیر میں انسانوں کی قیادت کریں اور پھر اس ریاست کو تکمیل واستحکام تک پہنچانے میں بنفس نفیس سربراہی کا کردار ادا کریں۔

رسول خدا ﷺ کی اس کامیابی کے مختلف مراحل کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ دین اسلام کو ماننے والے بالخصوص اور عالم انسانیت بالعموم، تعمیر ریاست کے نبوی منہج سے آگاہ ہوں اور اپنے حال و مستقبل کی نقشہ گری انہی خطوط پر کرسکیں۔ خاص طور پر وہ لوگ بھی اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ریاستی امور یا اجتماعی معاملات میں مذہب کے کردار اور اہمیت سے ناواقف ہیں۔

ا۔ قیام ریاست

ہجرت کے بعد نبی ﷺ نے ریاست مدینہ کے قیام کیلئے جدوجہد شروع کی۔ اس

سلسلہ میں آپؐ نے ابتدائی طور پر جو کام کیے، وہ تاریخ نے یوں محفوظ کیے ہیں:

۱۔ یثرب میں ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں رہائش پذیر ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر مختلف آبادیوں اور قبیلوں کا جائزہ لیا اور نئی ریاست کے دارالخلافہ کی تعمیر کے لیے ایک جگہ منتخب کی جو جبل سلع کے نزدیک ہونے کی وجہ سے دفاعی اور سیاسی لحاظ سے مضبوط تھی۔(۸)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بستی کے اردگرد کے علاقہ کو 'حرم' قرار دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے بقول حرم سے مراد Open City ہے یعنی ایسا شہر جس کے گرد جنگ ممنوع ہو۔ حرم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ نوزائیدہ مملکت اسلامیہ کی حدود کا تعین ہو گیا۔(۹)

۳۔ حرم کے قیام سے یثرب میں موجود خانہ جنگی اور انتشار ختم ہو گیا۔ میثاق مدینہ کی رو سے جوف مدینہ کی آبادیاں، قانونی طور پر نبی ﷺ کے زیر نگیں آ گئیں۔ یہی علاقہ تھا جہاں ابتداً اسلامی نظام نافذ کرنے کا عظیم تجربہ کیا گیا۔ یہ سرحدات بتدریج بڑھتی چلی گئیں اور کچھ عرصہ بعد اسلامی سلطنت پورے جزیرۃ العرب پر محیط ہو گئی۔

۴۔ دارالخلافہ کے مرکز میں مسجد نبوی تعمیر کی گئی اور اسکے صحن میں، صفہ کا چبوترہ قائم ہو ۔گویا مسلمانوں کا پہلا سماجی اور روحانی مرکز تعمیر کرنے کے ساتھ رسول کریمؐ نے صحابہ کی تعلیم و تربیت کا مرکز بھی قائم کر دیا۔ مسجد نبوی کے صحن کے ساتھ ہی حجرات تعمیر کر دیے گئے جو شروع میں مہاجرین صحابہ کے کام آئے اور بعد میں ازواج مطہراتؓ کے۔

۵۔ مہاجرین کی آبادکاری کا نظام 'مواخاۃ' کے ادارے کے ذریعے عمل میں آیا۔ یہ اخوت ایک اخلاقی، روحانی اور سماجی بندھن کا ذریعہ بنی۔ مہاجر بوجھ نہیں بنے بلکہ کمانے والے ہاتھ بن گئے۔ یوں مستقبل کے معاشی اور سماجی مسائل کا حل تلاش کیا گیا۔

۶۔ عیدگاہ، قربان گاہ اور قبرستان کے لئے علیحدہ علیحدہ جگہ مختص کی گئی۔ آنحضور ﷺ نے بیت الخلاء اور حمام کو رواج دیا جس سے طہارت و پاکیزگی کا اصول عام ہوا اور تہذیب و تمدن کا نیا سفر شروع ہوا۔

۷۔ دفاعی حکمت عملی کے تحت مدینہ کی پوری بستی کو فوجی چھاؤنی قرار دیا گیا، کسی بھی فرد کو جہاد کے لئے بلایا جا سکتا تھا۔ باقاعدہ فوجی مشقیں ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ خود معائنہ فرماتے۔

۸۔ مدینہ کے بازار بھی مسجد نبوی ﷺ کے قریب آباد کروانے کے بعد آپؐ نے یہ فرمان بھی جاری کیا کہ: هذا سوقكم لا خراج عليكم فيه ۔۔(۱۰)

آپؐ کے اس حکم سے منڈی میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ اس طرح آپ ﷺ نے مال تجارت کی آزادانہ درآمد و برآمد کی اجازت دے کر بین الاقوامی آزاد تجارت کی داغ بیل ڈال دی۔ گویا کسی ریاست کے قیام کیلئے جو ضروری اقدام ابتداہی میں ضروری ہوتے ہیں، رسولؐ خدا نے مکمل احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ اٹھائے اور نتیجتاً پہلی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا۔

۲۔ آئینی وقانونی بنیادیں

مذکورہ بالا اقدام کے بعد، آپؐ ریاست کے دستور و آئین کی تشکیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؐ نے تمام مسلمانوں (انصار و مہاجرین) کو جمع کیا او بنیادی قوانین بنائے۔ پھر اڑھائی ماہ کے اندر ہی یہود مدینہ کے ساتھ مذاکرات کے بعد 'میثاق مدینہ' کے نام سے ریاست مدینہ کا تحریری دستور منظور کروا کے نافذ کر دیا۔ اس میثاق کے ذریعے رسول خدا ﷺ نے اسلامی ریاست کو آئینی وقانونی بنیادیں فراہم کر دیں۔

میثاق مدینہ کو کتب تاریخ میں 'کتاب' اور 'صحیفہ' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جس کے معنی 'دستور العمل' اور 'فرائض نامے' کے ہیں۔(۱۱) اس معاہدے کی دفعات اور مضمرات کے سلسلہ میں معروف محقق ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:

اس دستور کے سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں، شامل تھے۔ یہ سیاسی وحدت 'محمد النبی رسول اللہ ﷺ' کے احکام کی اطاعت کرے گی۔

حصہ اول کے سب سے آخری فقرے میں بھی اللہ کی حاکمیت اور نبی کی اطاعت کا اصول دہرایا گیا ہے۔ جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور پر ہر چھوٹے بڑے کو دیا گیا اور وعدہ پناہ کو نباہنے کی ذمہ داری پوری امت پر رکھی گئی۔ آخری

عدالت مرافعہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کو قرار دیا گیا اور خون بہا کی ادائیگی کے لئے قدیم نظام بیمہ کی توثیق وتشریح کی گئی۔

حصہ دوم ۔۔۔۔یہودیوں سے متعلق ہے:

یہودیوں کے ساتھ یہ ایک جنگی حلیفی تھی کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اوران سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں۔البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں، یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی۔۔دس یہودی قبائل کا فرداًفرداًاور نام بنام ذکر کیا گیا اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس معاہدے کی رو سے آنحضرت ﷺ نے یہودیوں کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیئے۔ان کے شخصی قانون کے تحت فیصلے فرمائے۔یہودیوں نے آپ ﷺ کو مقتدر اعلیٰ مانا اور حدود حرم کو تسلیم کیا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ 'دیـــن' برتا گیا ہے جس میں مذہب اور حکومت کا مفہوم بیک وقت پایا جاتا ہے اور دونوں کو یکجا کر کے منظم و مرتب صورت میں میثاق مدینہ نے ایک ریاست کی شکل دے دی۔(۱۲)

باون دفعات پر مشتمل اس دستاویز کے ذریعے، رسول خدا ﷺ نے چوبیس محلوں پر مشتمل، اندازاً دس ہزار آبادی کو ایک شہری ریاست کی صورت منظم کرلیا۔دستور ریاست کے نفاذ سے مدینہ، عملاً ایک ریاست میں تبدیل ہوگیا جسکی سربراہی رسول خدا کے پاس تھی۔

۳۔انداز حکومت

کسی بھی ریاست میں اجتماعی معاملات کو منظم کرنے میں حکومت کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے۔حکومت کے بنیادی عناصر اور انداز حاکیت کے پورے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ریاست میں اقتدار کس کے پاس ہے اور دستور قانون کس طرح روبہ عمل ہیں، حکومتی کارندوں کا انتخاب کن بنیادوں پر ہوتا ہے اور عوام الناس کس حد تک حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔۔۔ان سب سوالوں کا جواب، طرز حکومت کے مطالعے اور مشاہدے سے ہی سامنے آتا ہے۔آیئے اس مقدمے کی روشنی میں ریاست مدینہ کے انداز حکومت کا تجزیاتی مطالعہ کر کے دیکھتے ہیں۔

اقتدار اعلیٰ

کسی ریاست میں سب سے بالا اختیار (جو سب پر حاکم ہو اور اسکے اوپر کوئی اور حاکم نہ ہو) کا نام اقتدار اعلیٰ ہے، آجکل کی ریاست میں یہ اختیار عوام کی اجتماعی ملکیت سمجھا جاتا ہے، جسے وہ انتخابات کے ایک نظام کے تحت اپنی نمائندہ حکومت کے حوالے کرتے ہیں۔ گویا جدید تصور حاکیت، کسی ریاست کے شہریوں کو ہی اس معاشرے کا مقتدر اعلیٰ تصور کرتا ہے۔

جب ہم مدینہ کی اسلامی ریاست کے طرز حکومت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں اقتدار اعلیٰ نہ تو کسی فرد واحد کو حاصل تھا اور نہ ہی افراد کے کسی ادارے (Forum) یا افراد کی اکثریت (Masses) کو۔۔۔ بلکہ مقتدر اعلیٰ صرف اور صرف خالق کائنات کو تسلیم کیا گیا۔ محور وحی ہونے کے ناطے، رسول اللہ ﷺ کی ذات عالی صفات، اسکے عملی اظہار کا ذریعہ تھی۔ دستور ریاست یعنی میثاق مدینہ کے آغاز ہی میں اس حقیقت کو تمام فریقوں کی جانب سے قبول کر لیا گیا تھا۔

اقتدار اعلیٰ کے اس تصور کی بنیاد دراصل قرآن حکیم کی وہ آیات ہیں جن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا اصل مالک اللہ سبحانہ تعالیٰ ہے، وہ بلا شرکت غیرے مقتدر و حاکم کائنات ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قل اللّٰھمّ ملٰک الملک توء تی الملک من تشآء و تنزع الملک ممّن تشآء و تعزّ من تشآء وتذلّ من تشآء بیدک الخیر انّک علیٰ کلّ شیء قدیر o (آل عمران ۳:۲۶)

اس اصول کی عملی صورت یہ تھی کہ ایک طرف تو کتاب الٰہی کا بتدریج نزول ہو رہا تھا جس میں اجتماعی زندگی کے بنیادی اصول، ایک ایک کر کے سمجھائے جا رہے تھے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے نمائندہ خاص جناب محمد رسول اللہ ﷺ ان اصولوں کو بتدریج، نافذ کرتے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمان جاری کیا کہ:

علیکم بکتاب اللہ ، أحلوا حلالہ م حرموا حرامہ۔ (۱۳)

آئین ریاست

ریاست مدینہ میں، آغاز سفر ہی سے طے کر دیا گیا کہ آئین وقانون کے بنیادی اصول وہی جاری وساری ہوں گے جو رب کائنات نے عطا کیے ہیں اور اس کی عملی صورت رسول خدا تجویز فرمائیں گے۔

ارشاد خداوندی ہے:

إنا أنزلنا إليک الکتٰب بالحق لتحکم بين الناس بما أراک الله... الآخر (النساء: ۱۰۵)

(بے شک ہم نے کتاب حق آپ پر نازل کی تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس طرح فیصلے کریں جیسے اللہ آپ کو دکھائے)۔

گویا اس حکم کے تحت آپ کو آئین خداوندی کی عملی تعبیر کا کام کرنا تھا۔ اس کی تشریح و تعبیر کے علاوہ اس کی روشنی میں آئین سازی کا مکمل اختیار بھی آپ کو حاصل تھا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

یامرهم بالمعروف و ینهاهم عن المنکر و یحل لهم الطیبات و یحرم علیهم الخبائث.....الآخر (الاعراف۷: ۱۵۷)

رسول خدا اس حیثیت میں ریاست مدینہ کے آئین ساز حکمران تھے اور دستوری طور پر آپ کی بات آخری بات اور آپ کا فیصلہ آخری فیصلہ تھا۔ آپ ﷺ نے اسی ذمہ داری کے تحت قرآن کے احکام کی تشریح کر کے ان کی تنفیذ کا عظیم الشان کام کیا۔ مثلاً اقام صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے قرآنی حکم کی روشنی میں نماز کو آداب وشرائط اور اوقات وفضائل کی تفصیل کے ساتھ فرض قرار دیا اور زکوٰۃ کو شرح اور نصاب کے ساتھ نافذ کیا۔ اس طرح آپ نے حدود قرآنی نافذ کرنے کی تفصیلی شرائط بتائیں اور ان حدود وتعزیرات کا عملاً نفاذ کیا۔ گویا اللہ کی فرمانروائی کتاب الٰہی کے تحت رسول خدا ﷺ کی حکمرانی میں قیام پذیر ہوئی۔ اس لیے کہ قرآن کا ارشاد ہے:

فلا وربک لا یومنون حتّٰی یحکموک فیما شجر بینهم ثمّ لا یجدوا فی انفسهم حرجاً ممّا قضیت و یسلّموا تسلیماً ٥ (النساء۴: ۶۵)

(پس نہیں تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے اختلاف میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ دے اس پر اپنے نفس میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں اور سربسر تسلیم کرلیں۔)

معاہدہ بیعت

اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے خدائے بزرگ و برتر کے عطا کردہ اختیارات کو (بطور شارع اور شارح کے) استعمال کرتے ہوئے حاکیت الٰہیہ قائم کی۔ اس حاکیت کے قیام میں عوام الناس کی تائید و مرضی شامل کرنے کے لئے 'بیعت' کا ادارہ قائم کیا۔ معاہدہ بیعت دراصل ریاست کے باشندوں کی طرف سے حاکم وقت کی رضا کارانہ اطاعت اور شعوری محکومیت کے فیصلے کا اعلان تھا جس کی با قاعدہ آئینی و قانونی حیثیت متعین کی گئی۔

بیعۃ، اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے سودا اور تجارت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ سلطان کے ساتھ اس لفظ کا استعمال دراصل حاکم کے ساتھ محکوم کے، اقرار اطاعت کے معنوں میں ہوتا ہے۔ (۱۴)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیروکاروں سے، بیعہ عقبہ ثانیہ ۱۲ نبوی سے اس ادارے کا آغاز کیا جس میں آپ نے اہل یثرب کے بارہ نقیب یا نمائندے مقرر کئے اور یوں یثرب میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ معاہدہ بیعت کے الفاظ صراحت کرتے ہیں کہ یہ معاہدہ بظاہر حاکم وقت، رسول اللہ ﷺ اور ان کے پیروکاروں کے درمیان ہے مگر اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ بندے کا عہد، اپنے رب کے ساتھ ہے جو بذریعہ رسول اللہ قرار پاتا ہے۔

قرآن نے اس حقیقت پر مہر تصدیق یوں ثبت کی ہے:

إن الذين يبايعونک إنما يبايعون الله .... الآخر (الفتح: ۱۰)

شورائیت

قرآن مجید نے واضح کیا ہے کہ اس کے دیئے ہوئے دستور و قانون کے بنیادی خدو خال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ تاہم، اللہ تعالیٰ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ ہے کہ وہ دستور کی جزئیات سے متعلق معاملات اور دستور کے نفاذ کی حکمت عملی کے سلسلہ میں، اپنے پیرکاروں سے مشورہ ضرور کیا کریں (آل عمران: ۱۵۹) رسول اللہ ﷺ کے پیروکاروں کی اہم خصوصیت

بیان کی گئی ہے کہ وہ آپس میں مشورہ ضرور کرتے ہیں۔(الشوری: ۳۸)

دستور قرآن کو اس کی اصلی حالت میں نافذ کرنے والی ہستی رسول اللہ ﷺ تھی۔اس دستور کے علمبردار، اس کو وسعت دینے والے اور اس کے لئے اپنا سب کچھ لگا دینے والے آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ تھے۔آپ ﷺ ہر اہم موقع پر ان سے مشورہ کرتے اور فیصلے ان کے سپرد کرتے رہے۔آپؐ نے شوریٰ کے اجلاس کے لئے مکہ میں تو'دار ارقم 'کو منتخب فرمایا جو پہلا'دار الاسلام 'قرار پایا۔مدینہ میں آپ نے کھلے میدانوں اور مسجد نبوی کے صحن کو ایوان شوریٰ کے طور پر استعمال فرمایا۔آپ ﷺ ہر اہم معاملہ میں اہل ایمان کے نمائندوں کا اجلاس طلب کرتے اور مشاورت کے بعد فیصلہ فرماتے۔

اس سلسلہ کی چند مثالیں یہ ہیں:اذان کی ابتداء اور سن ہجری کی ابتداء کے لئے شوریٰ ،غزوات کے مواقع اور شورائے حدیبیہ۔۔۔(۱۵)

عمال حکومت

جوں جوں ریاست وسیع ہوتی گئی رسول اللہ ﷺ ،انتظامی لحاظ سے اسے تقسیم کرتے گئے ،حتیٰ کہ چودہ صوبے قائم ہوئے۔ہر ایک صوبے کا حکمران رسول اللہ کا متعین کردہ والی ہوتا تھا۔یہ نمائندگان رسول ﷺ نہ صرف صوبے کے حاکم ووالی ہوتے بلکہ وہاں ایک مبلغ دین اور معلم اخلاق کا فریضہ بھی انجام دیتے۔نمازوں سے لے کر لوگوں کے معاملات تک میں،امامت و راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے۔ضرورت پڑنے پر آپ ﷺ کی طرف سے ان حکام کی تبدیلی و تبادلہ عمل میں آتا اور کارکردگی تسلی بخش نہ ہونے پر ان کا احتساب ہوتا اور معزولی بھی عمل میں آتی۔

عمال حکومت کی تقرری کے وقت رسول اللہ ﷺ ان کو تفصیلی ہدایات دیتے جن میں ان کی ذمہ داری کا تعین، احساس ذمہ داری پر زور،اور فرائض کی تفصیل بیان ہوتی۔اس سلسلے میں ایک مثال،معاذ بن جبل،والی یمن کے نام آپ کا وہ وصیت نامہ ہے جو امام مسلم نے روایت کیا ہے:

إنك ستأتي قوما من أهل الكتاب فادعهم إلىٰ شهادة أن لا إله إلا الله و إلى رسول الله فإن هم أطاعوا لذلك فاعلمهم أن الله افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم و ليلة، فإن أطاعوا لذلك فاعلمهم أن الله افترض عليهم تؤخذ من

أغنيائهم و ترد إلى فقرئهم ، فإن أطاعوا لذلك فإياك و كرائم أموالهم و اتق دعوة المظلوم، فإن ليس بينهما و بين الله حجاب ۔(١٦)

رسول کریم ﷺ کی ان ہدایات سے واضح ہوتا ہے کہ ایک والی ریاست کی ذمہ داریوں میں قانون کا نفاذ، امن وامان، عام انتظام سلطنت، اشاعت اسلام، مقدمات کے فیصلے اور محصولات کی وصولی بھی شامل تھیں۔

فرائض کی بجاآوری کے نتیجے میں، ریاست کی جانب سے عمال کو جو معاوضہ ملتا اس کی تفصیل ہمیں اس حدیث کی عبارت سے ملتی ہے، جو ابوداود نے نقل کی ہے:

من كان لنا عاملاً فليكتسب زوجه فإن لم يكن له خادم ، فليكتسب خادما و إن لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا و من اتخذ غير ذلك فهو غال ۔(١٧)

(جو ہمارا عامل ہو اس کو اس کی ایک بیوی کا خرچ لینا چاہئے، اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو مکان کا (خرچ) اس سے زیادہ اگر کوئی حاصل کرے تو وہ خائن ہو گا۔)

مالیات

سیرۃ وتاریخ کی کتب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ رسول خدا کیطرف سے مالیات کے نظام میں بہتری کے لیے کئی قدم اٹھائے گئے۔ اقتصاد و معاشیات کی بنیادیں اٹھانے کے لیے، رسول اللہ ﷺ نے اجارہ داریوں کی حوصلہ شکنی کی اور رزق کمانے کے لئے سب کو یکساں مواقع کی فراہمی کو یقینی بنایا، شخصی ملکیت کا حق (کچھ خاص شرائط کے ساتھ) اور مرد وعورت دونوں کو ان کی کمائی ہوئی دولت میں یکساں حق ملکیت عطا کیا۔ ایک طرف آپ ﷺ نے دولت کی گردش کا اہتمام کیا جس سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کو حق دیا گیا۔ دوسری جانب فضول خرچی اور کنجوسی ۔۔۔ دونوں انتہائی رویوں کی حوصلہ شکنی کی تاکہ معاشی توازن برقرار رہے۔

ریاست کی آمدن اور اخراجات کے لیے شعبہ محاصل قائم کیا جس کا کام ریاست کے مالیات کا نظام سنبھالنا اور حسابات رکھنا تھا۔ یہ شعبہ مزید مختلف شاخوں میں تقسیم تھا۔ کسی کے ذمہ

درختوں پر لگے پھلوں کا جائزہ، کسی کے ذمہ غنائم کی نگرانی اور کسی کے ذمہ صدقات وزکوٰۃ کا رکارڈ ہوتا۔ آپ نے مال غنیمت کی ذمہ داری کے لئے صاحب المغانم مقرر کیا۔

دیگر شعبہ جات میں، خمس رسول کے نگران، صاحب الجزیہ، صاحب الاعشار، متولی خراج اور ضامن وغیرہ کا تقرر کیا۔ آپؐ نے مختلف قبائل کے لئے محصلین زکوٰۃ و جزیہ مقرر کئے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے صدقات وصول کرتے اور ریاست کے مرکزی بیت المال میں جمع کرواتے۔ آنحضرت نے اپنے خاندان پر صدقہ وزکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان نبوت کا کوئی شخص صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا۔ (۱۸)

۴۔ استحکام ریاست

تاریخ انسانی کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ کسی ریاست کے استحکام کا دارومدار عدل و انصاف کے قیام اور اسکے برقرار رکھنے سے ہی ممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ریاست کا مقصد وجود ہی قیام عدل ہے، لھٰذا کسی بھی منظم معاشرے کے مستحکم ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ اس معاشرے میں نظام عدل اپنی پورے آداب و شرائط کے ساتھ نافذ ہو۔ قرآن پاک میں اسلامی ریاست کو عدل کے سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے:

ان اللّٰہ یامرکم ان تئودّا الامانٰت الیٰ اھلھا و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا با لعدل..... الآخر (النساء۴: ۵۸)

اسی طرح اللہ کی طرف سے رسولوں کے مقصد بعثت کی یوں وضاحت کی ہے:

لقد أرسلنا رسلنا بالبینٰت و أنزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط.... الآخر (الحدید۵۷: ۲۵)

اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ بطور رسول خدا اور بطور سربراہ ریاست، عدل وانصاف کے قیام کے ذمہ دار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید آپ کو یہ اعلان کردینے کی ہدایت کرتا ہے: وامرت لاعدل بینکم.... (الشوریٰ: ۱۵) (اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں)۔

یادر ہے کہ اسلام میں حکمرانی اور عدل وانصاف ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے حکمرانی اور منصفی کے لئے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، انکا مادہ ایک ہی لفظ یعنی 'حکم' ہے۔ سربراہ ریاست کو 'حاکم' جبکہ منصف کو 'حکم' کہا جاتا ہے۔(۱۹)

شعبہ عدالت

دور رسالت مآب ﷺ میں حکومت کا اہم ترین شعبہ عدالت تھا۔ مرکز یعنی مدینہ میں آپ ﷺ خود چیف جسٹس کے طور پر کام کرتے۔ آپ کی عدالت عالیہ میں چوبیس گھنٹے ہر قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت ہوتی۔ عرب میں نظام عدل کے منتشر حصے کام کر رہے تھے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے عدالت کو ریاست کا مرکزی معاملہ بنا دیا اور دستور مدینہ میں اس کے قیام واجراء کی بنیادیں رکھ دیں۔

سیرت رسولؐ کے مطالعہ سے یہ بات کھل کے سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے عدل کے قیام کے لیے اپنے اسوہ کو ایک مثال بنا کے پیش کیا اور اپنی ذات اور خاندان سے ہی عدل کے تقاضے پورے کرنے کا آغاز کیا۔ ذیل کی مشہور حدیث مبارکہ جس کو دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے آپؐ کے اصول عدل کی وضاحت کرتی ہے:

والّذی نفس محمّد بیده لو انّ فاطمة(بنت محمّد) فعلت ذالك لقطعت یدها۔(۲۰)

(قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر محمد کی اپنی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی

تو میں ضرور اسکا ہاتھ کاٹ دیتا۔)

اس بنیادی اصول کی روشنی میں، جب ریاست مدینہ میں موجود عدالتی نظام کا تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ صوبائی حکومتوں کے والیوں کو بطور جج کام کرنے کا بھی حکم تھا۔ مثلاً عمر بن حزم جب یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو انہیں تحریری ہدایت نامہ دیا گیا جس میں عدل وانصاف کی تاکید موجود ہے۔

۲۔ اہل کتاب غیر مسلموں کے مقدموں میں رسول اللہ ﷺ ان کے مذہب کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ یہ اصول بعد میں مستقل قانون کا درجہ اختیار کر گیا۔

۳۔انصار کے قبائل کی حد تک آنحضرت ﷺ نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ میں ہر ایک قبیلے کا ایک ایک نقیب مقرر کیا تھا جو اپنے قبیلے کی نمائندگی اور انکے باہمی نزاعات کے فیصلوں کا ذمہ دار تھا۔اگر کسی معاملے میں نقیب کا فیصلہ تشفی کا سامان نہ کرتا تو معاملہ آنحضرت ﷺ کے پاس آتا۔نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں کا ایک افسر ہوتا تھا جسے عریف کہتے تھے۔(۲۱)

عدالتی اصلاحات

شعبہ عدالت میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ بے مثل اصلاحات کا نفاذ ہوا۔جن میں انسانی جان اور عزت نفس کا احترام،حقوق انسانی اور وقار انسانی کا تحفظ شامل ہیں۔مثلاً آپؐ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک مسلمان نے ایک ذمّی کو قتل کر دیا تھا۔آپ نے نہ صرف قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا بلکہ غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کا اپنے آپکو ذمہ دار قرار دیا۔ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے اعلان فرمادیا کہ:

الا من ظلم معاهداً او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شياً بغير طيب نفس فاناحجيجه يوم القيامة۔(۲۲)

(خبردار!جو شخص کسی معاہد پر ظلم کریگا یا اسکے حقوق میں کمی کریگا یا اسکی طاقت سے زیادہ اس پر بار
ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اسکی مرضی کیخلاف وصول کریگا،اسکے خلاف قیامت کے دن میں
خود مدعی بنوں گا۔)

دنیا کے عدالتی نظام پہ جس شخص کی نظر ہو اور وہ قرون وسطیٰ کی دنیا کے نظم عدالت سے بھی باخبر ہو تو وہ کچھ حیران کن عدالتی اصلاحات دیکھے گا جو آپؐ نے اس دور میں پہلی دفعہ متعارف کروائیں۔آپؐ نے ایک طرف تو غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا اور دوسری طرف حاکم و محکوم کے لئے ایک ہی قانون عملاً نافذ کر دکھایا۔۔۔یوں قانونی مساوات کا عملی مظہر پہلی دفعہ نظر آیا۔وہ عدالتی اصلاحات جو آپؐ نے انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ متعارف کروائیں،درج ذیل تھیں:

ا۔عمد، مشابہ عمد اور خطا میں فرق کیا گیا اور جرم میں،مجرم کی نیت کے عمل

دخل کو سب سے پہلے دیکھا گیا، ضمان کا قانون مقرر ہوا۔ ہرجانے کا معاوضہ رقم کیصورت میں مقرر ہوا، بے رحم انصاف کی جگہ استحسان کو عدالتوں میں رواج دیا گیا اور کسی زیادتی کی ذمہ داری کو 'شخصی' قرار دیا گیا، ایک کا بار، دوسرے پر لادنے کا سلسلہ نہیں، ۴۔شک کا فائدہ ملزم کو دینا اور غلطی سے سزا دینے کی جگہ، غلطی سے رہا کرنا، اصولاً بہتر قرار دیا گیا، آپؐ نے ہدایات جاری کیں کہ:

فإن الإمام أن يخطئ في العفو خيرا من أن يخطئ في العقوبة۔

۲۔رسول اللہ ﷺ نے یہ' جدت' بھی شروع کی کہ انسانوں کے سوا باقی سب مخلوق کو ذمہ داری سے بری کر دیا ورنہ عرب میں کوئی گڑھا اور جانور بھی کسی آدمی کے ضرر اور ہلاکت کا باعث ہوتا تو ذمہ داری سے بری نہ ہوتا۔ آپ ﷺ نے صراحت فرمادی کہ: العجماء جبار و المعدن جبار و البئر جبار۔ (۲۳)

۳۔انصاف رسانی کے لئے قاضی کو صرف روداد پر فیصلہ کرنے کی تلقین کی گئی اور اپنی خانگی معلومات کو دخل دینے سے روکا گیا۔ دونوں فریقوں کا مؤقف سننے پر زور دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ نے ہدایت کی: فلا تقض بينهم حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الأول۔

آنحضرت ﷺ نے قانون کا یہ قاعدہ بھی مقرر فرمایا کہ ثبوت پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے۔ اگر مدعی ثبوت نہ دے سکے تو دعویٰ کے منکر یعنی مدعا علیہ سے قسم لی جائے۔ اس قاعدے کو بدلنے کی اب تک کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی:

البينة على المدعي و اليمين على المدعىٰ عليه۔ (۲۴)

۴۔قانون شہادت کو تفصیلات کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ قرآن کی ہدایات کے مطابق سزا یافتہ، گناہ کبیرہ کے مرتکب، جھوٹے اور فاسق وبدکار کی شہادت غیر معتبر قراری دی گئی۔ تفتیش، تنقیح ،شہادت اور جرح کے قواعد، گواہوں کی تعداد، عمر، مردوعورت، مسلم اور غیر مسلم کی شہادت اور غیر ملکی مستامنوں کے عدالتی حقوق ـــــ سب کچھ کے تفصیلی قواعد کا اجراء ہوا۔ قاضیوں کے لئے تنخواہوں کا نظام بھی نافذ کیا گیا۔ (۲۵)

۵۔انگریزی قانون کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں دائر

کیا جا سکتا کیونکہ King can do no wrong لیکن۔۔۔۔اسلام کسی انسان کو خطا سے مبرا نہیں سمجھتا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر کیے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے:

رایت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم یقید من نفسه۔ (۲۶)

تعلیمی منصوبہ

قرآن پاک کی پہلی وحی (سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات) اقراء (یعنی پڑھنے کے حکم) سے شروع ہوتی ہے اور علم الانسان مالم یعلم (انسان کو وہ علم عطا کیا گیا جو اسکے پاس نہیں تھا) پہ ختم ہوتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں، کائنات میں پہلے انسان اور نبی، آدمؑ کی فوقیت و برتری کی بنیاد ان کے علم کو قرار دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو ربّ زدنی علماً (اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما) کی دعا سکھائی ہے۔ علم کی اسی فضیلت کے پیش نظر، اسلام (اس سلسلہ میں دنیا کا واحد مذہب ہے) نے حصول علم کو رسولؐ کے ذریعے فرض قرار دیا۔ نبی آخرالزماںؐ نے جہاں انسانیت کو دین اسلام کے ذریعے، جاہلیت کی تاریکی سے نکالا وہاں تعلیم کے ذریعے معاشرے کو جہالت کے اندھیروں سے پاک کیا۔

ریاست مدینہ میں خواندگی اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جو اقدام کیے گئے انکا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے بے شمار مصروفیات کے باوجود تعلیمی منصوبہ بندی کی طرف بھرپور توجہ دی اور ذاتی طور پر آپ اس کی نگرانی فرماتے رہے۔ سعید بن العاص جو کہ خوشنویس تھے 'معلم حکمت' مقرر ہوئے جن کے ذمے لوگوں کو لکھنا سکھانا تھا۔ حضرت عبادہ بن الصامت کو، صفہ میں معلم مامور کیا گیا۔ ہجرت سے ڈیڑھ سال بعد جنگ بدر میں گرفتار ہو کر آنے والے قیدیوں کے لئے رہائی کا یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے۔

۲۔ صفہ ۔۔ مسجد نبوی کے صحن میں ایک احاطہ جو دراصل ایک اقامتی درسگاہ کے طو شروع کیا گیا، اس میں قرآن، تجوید، فقہ اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم ہوتی۔ یہاں مستقل طور پر رہائش پذیر طلبہ کے علاوہ محدود وقت کے لئے پڑھنے والے بھی آتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس کی

نگرانی فرماتے۔ خواتین کی تعلیم کے لئے آپ ﷺ نے ہفتہ میں ایک دن مخصوص کیا، جب مسجد نبوی میں صرف خواتین تعلیم کے لئے آتیں۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی خدمات بے مثال ہیں۔

۳۔ قبائلی وفود اسلام قبول کرنے کی غرض سے جناب رسول اللہ ﷺ سے ملنے آتے تو آپ ان کے ساتھ کسی تربیت یافتہ صحابی کو بطور استاد روانہ کر دیتے تا کہ نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ہو۔ یہ صحابی اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے واپس آ جاتے۔ بیر معونہ کے مشہور واقعہ میں آپ ﷺ نے ستر قاری قرآنی تعلیم کے لئے روانہ کئے تھے۔ (۲۷)

۴۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے معلمین اور علماء کو معاشرے میں عزت و تکریم کا اعلیٰ مقام عطا کیا حتی کہ انہیں انبیاء کا وارث قرار دے کر ان کے سماجی مقام کا تعین کیا۔ آپ نے معلمین و مدرسین کو طلبہ پر سختی سے احتراز کرنے اور لوگوں کے فہم کے مطابق ان کو بات سمجھانے کی ہدایت فرمائی۔

۵۔ تحریر و کتابت کے سلسلہ میں نفاست وصفائی کے آداب بتائے۔ کاغذ کو سیاہی خشک ہونے پر تہہ کرنے اور لکھنے میں تھوڑے وقفہ کے دوران میں قلم کان پر لگا لینے کے طریقے سکھائے۔ (۲۸)

۶۔ خطوط پر مہر لگانے کا رواج بھی سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے شروع کیا۔ آپ کی مہر جس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا، سرکاری ہدایت نامے اور دستاویزات پر ثبت ہوتی تھی۔ (۲۹)

۷۔ مدینہ میں صفہ کے علاوہ کم از کم ۹ مسجد مکاتب 'سکولز' کام کر رہے تھے اور ہر محلے کے لیے تعلیمی راہنمائی جاری تھی۔ رسول اللہ ﷺ خود ان کا معائنہ کرتے اور ضروری ہدایات دیتے۔ جہاں تک نصاب تعلیم کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ رقمطراز ہیں کہ:

ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری تھا۔ معینہ کتب پڑھانے کی جگہ معینہ معلم کے پاس لوگ جاتے اور وہ جو کچھ پڑھا سکتا تھا اس سے پڑھتے۔ بہر حال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی، پیراکی، تقسیم ترکہ کی ریاضی، مبادیٔ طب، علم ہیئت، علم انساب اور علم تجوید قرآن کی تعلیم دی جائے۔ (۳۰)

۵۔ نظم معیشت

قرآن کی معاشی تعلیمات، جزئی معاشیات اور کلی معاشیات کے تمام بنیادی اصولوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں اجتماعی ذرائع، محاصل اور مصارف سے لے کر انفرادی ذرائع آمدن و تصرف اور اکتساب رزق کی ہدایات تک۔۔۔ایک صاف ستھرا مکمل نظام موجود ہے۔

قرآن نے انسانی سعی کو اقتصاد کی بنیاد قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں ریاستی مداخلت کو کم سے کم رکھا گیا ہے۔ یہ دنیا کی واحد الہامی کتاب ہے جس نے معیشت اور اقتصادیات پر بھی تفصیل سے ہدایات مہیا کی ہیں، جو کہ رسول خدا کی معاشی حکمت عملی میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں تک اس سلسلہ میں قرآن حکیم کے عطا کردہ بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، انکا خلاصہ حسب ذیل بنتا ہے:

۱۔ اللہ نے زمینی وسائل انسان کے لیے پیدا کیے ہیں۔
۲۔ اللہ انسانوں کے درمیان معیشتوں کی تقسیم اور تقدیر کا فیصلہ فرماتا ہے۔
۳۔ رزق اللہ کی عطا اور فضل ہے، اس نعمت کے لیے کوشش کی جائے۔
۴۔ رزق ایک وہ جو ہر صورت میں مل کے رہیگا اور دوسرا انسان کی کوشش کیساتھ وابستہ ہے۔
۵۔ اپنے نصیب کا حصہ وصول کرنا ہر ایک کا حق ہے۔
۶۔ انسان کے شایان شان یہ ہے کہ وہ پاکیزہ اور حلال کھائے۔
۷۔ اس سلسلہ میں ناجائز راستوں کا اختیار کرنا اللہ کی نافرمانی ہے۔
۸۔ ذرائع اور وسائل پر قبضہ کر کے بیٹھ جانا اپنے اور دوسروں کے لیے مہلک ہے۔
۹۔ ذرائع اور وسائل کے حصول اور انکے استعمال میں اعتدال ہی میں فلاح ہے۔
۱۰۔ محروموں اور سائلوں کے لیے حصہ نکالنا، صاحبان ثروت کیلیے لازم ہے۔
۱۱۔ یہ وسائل ایک خاص مہلت عمل کیساتھ انسان کو مہیا کیے گئے ہیں۔
۱۲۔ ایک دن انسان کو اپنے رب کے سامنے ان نعمتوں کا حساب دینا ہے۔ (۳۱)

ان اصول وضوابط کی روشنی میں، رسول اللہ ﷺ کی حکومت کیطرف سے، جو معاشی

نظام ترتیب دیا گیا اسکی دو بنیادیں تھیں:

(ا) تمام خلق اللہ کا کنبہ ہے۔ (ب) تمام انسان اللہ کے نزدیک برابر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ریاست میں یہ اہتمام کیا کہ ایک تو اللہ کے کنبے کا کوئی فرد کھانے، لباس اور رہائش سے محروم نہ رہے اور دوسرے یہ کہ اللہ کے بندوں میں سب کو انسانیت کے تمام حقوق میں برابر سمجھا جائے۔ یوں معاشی مساوات کو آئینی تحفظ دیا گیا۔

ذرائع آمدن، مدات محاصل

عہد رسالت ﷺ میں عوام کے لئے انفرادی اقتصادیات کے ذرائع زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، وراثت اور بیت المال تھے جبکہ ریاستی سطح پر آمدن مدات مندرجہ ذیل تھیں:

زکوٰۃ و عشر (التوبہ ۹: ۱۰۳): سونا، چاندی، مال تجارت، تجارتی مکانوں، جانوروں اور زائد دولت پر ۲ھ میں چالیسواں حصہ (صاحب نصاب کے لئے) اللہ کی راہ میں دینا فرض ہوا۔ اس طرح مسلمانوں کو اپنے مال پاک رکھنے کا سلیقہ بتایا گیا اور اس حصہ مال کو معاشرے کے غریب طبقوں میں تقسیم کیا جاتا۔ عشر، مسلمان کاشتکاروں پر عائد شدہ لگان تھا جو بارانی زمینوں پر فصل کا دسواں حصہ اور چاہی زمینوں پر بیسواں حصہ فرض تھا۔

مال غنیمت (الانفال ۸: ۴۱): کفر واسلام کی جنگوں میں قیدی، عورتیں اور اموال وغیرہ کی وہ آمدن جو اتفاقی طور پر مسلمانوں کو حاصل ہوتی تھی۔ مال غنیمت کا رواج قدیم عرب میں اسلام سے پہلے موجود تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ، قرآن کی ہدایت کے مطابق اس آمدن کا ۴/۵ حصہ تو شرکائے جنگ کے درمیان برابری کی بنیاد پر تقسیم کرتے اور ۱/۵ حصہ بیت المال کے لئے محفوظ کرتے جسے 'خمس' کہا جاتا تھا اور یہ سربراہ مملکت کے لئے مختص تھا۔

خمس کے مصارف قرآن نے سورۃ الانفال میں یہ بیان کئے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، قرابت دار، مساکین اور مسافروں کے لئے ہے۔ گویا یہ مال بنیادی طور پر ضرورت مندوں اور غرباء کے لئے ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مد بھی بنیادی طور پر ضرورت مند عوام الناس کے اجتماعی مفاد کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ:

سربراہ مملکت کے لئے مال غنیمت کا جو ۱/۵ حصہ تھا اس کی بھی پانچ ذیلی مدات تھیں اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کا حصہ 'خمس' میں پانچواں تھا اور کل مال غنیمت میں پچیسواں۔۔۔۔ رحمۃ

اس نظام کا ایک حصہ تو یہ تھا کہ ریاست، صاحب نصاب لوگوں سے اجتماعی معاشی نظام کے لئے لازمی طور پر حصہ وصول کرتی جیسے زکوٰۃ وغیرہ۔۔۔۔دوسرا یہ تھا کہ صدقات کی ترویج کے ذریعے گردش دولت کا اہتمام اور معاشی طور پر کمزور لوگوں کو، معاشرے کے ساتھ چلانے کی سعی ہر وقت جاری رہتی ۔رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر کا حکم زکوٰۃ کی فرضیت سے بھی پہلے دیا اور مسلمانوں میں سے ہر آزاد اور غلام مرد و عورت پر فرض کیا۔

صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب اور ترویج رسول اللہ ﷺ نے ایسے انداز سے کی کہ خود ہر وقت تقسیم ہی کرتے رہتے ،لہٰذا لوگوں میں محروم طبقوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی معاشی ضرورتوں کا خیال رکھنا، مدنی معاشرے کا طرۂ امتیاز بن گیا۔(۳۵) قرآن پاک کے قانون(التوبہ ۹ : ۶۰) کیمطابق، رسول اللہ ﷺ نے صدقات کو مندرجہ ذیل مدات میں خرچ کرنے کا حکم دیا:

فقرء او مساکین (معاشی طور پر ناگفتہ بہ حالت میں گرفتار لوگ)

عاملین زکوٰۃ (صدقات کی وصولی اور تقسیم کے کام پر مامور لوگ)

مؤلفہ القلوب (غیر مسلم اور مخالفین اسلام کے ساتھ بھلائی کے کاموں پر)

فی الرقاب (غلامی میں گرفتار مفلوک الحال طبقہ)

غارمین (مقروضوں کی مدد ورقرض چھوڑ کر مرنے والے افراد کی اولاد کی کفالت)

فی سبیل اللہ (دین اسلام کے پھیلاؤ اور ان افراد پر جو جہاد میں مصروف ہوں)

ابن السبیل (مسافروں میں ضرورت مند لوگ)

اس تحقیقی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا نے ،ریاست مدینہ کی طرف سے مجبور طبقوں کی کفالت، ہر پہلو سے یوں کی کہ آج کی فلاحی ریاست اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان ہمیشہ یادرکھا جائے گا: أنا ولي من لا ولي له۔ جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست، اللہ اور اس کا رسول ہے۔(۳۶)

تاریخی اصلاحات معیشت

علم معاشیات کا طالب علم جب ریاست مدینہ کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ رسول خدا ﷺ کے معاشی اقدامات پہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عوام الناس کی معاشی بہبود کے

للعالمین ﷺ اپنے حصہ میں آنے والے اس مال کو مزید تین حصوں میں تقسیم کرتے: ا۔اللہ کی راہ میں دیتے ۲۔اپنے نائب کو عطا کرتے اور ۳۔یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں بانٹ دیتے۔(۳۲)

فَے (الحشر ۵۹: ۵۔۸) :وہ مال اور زمین جو بغیر جنگ کے ریاست کی ملکیت میں آ جائے۔رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایسے مال کو سرکاری سطح پر اللہ، رسول ﷺ، اہل قربت، یتامیٰ، مساکین، مسافروں اور مہاجرین پر صرف کیا جاتا۔مثال کے طور پر بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر کے علاقے کی زمین وغیرہ کو رسول اللہ ﷺ نے سرکاری ملکیت قرار دے کر مذکورہ بالا مدات میں خرچ کر دیا۔

خراج :زمین پر محصول جو غیر مسلمانوں سے وصول کیا جاتا۔فتح خیبر کے موقع پر یہ رقم مجاہدین کی تنخواہوں اور دیگر قومی اخراجات کی مدات میں صرف کی۔(۳۳)

جزیہ (التوبہ ۹:۲۹) :قرآن کی ہدایت کے مطابق غیر مسلموں سے ان کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کے معاوضہ میں ریاست مدینہ یہ ٹیکس وصول کرتی تھی جس کے بدلے میں انہیں عقیدے اور مذہب کی آزادی دی جاتی اور فوجی خدمت لینے سے مستثنیٰ رکھا جاتا۔

جزیہ، غیر مسلموں کے صرف آزاد مردوں پر واجب تھا، جب کہ اقلیتوں کے بچے، معذور، بوڑھے، عورتیں، غرباء و مفلسین اور فاتر العقل افراد سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔اندھے، مفلوج، اپاہج اور راہب لوگ بھی اس سے مستثنیٰ تھے۔اس ٹیکس کی وصولی میں بھی انصاف اور نرمی سے کام لیا جاتا اور نہایت محتاط رویے کے ساتھ وصول کیا جاتا۔اگر کوئی 'ذمی' (جزیہ دینے والا غیر مسلم) مسلمان ہو جاتا یا ریاست کی کوئی خدمت بجا لاتا تو اس سے یہ ٹیکس ساقط ہو جاتا۔(۳۴)

صدقات کی ترویج

اسلامی ریاست میں معاشیات کی بنیاد، مال و دولت کی گردش پر ہے۔اسلام افراد ریاست کو دولت اکٹھی کرنے کی بجائے دولت تقسیم کرنے پر لگاتا ہے۔قرآن نے جگہ جگہ انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دی ہے۔ریاست مدینہ میں، صاحبان مال و زر سے دولت کی وصولی اور ضرورت مندوں میں اس کی تقسیم کا اہتمام سرکاری سطح پر کیا گیا۔کیونکہ قرآن نے زکوٰۃ کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اس سے دولت کا بہاؤ غریبوں کیطرف ہوتا ہے۔(الحشر : ۷)

حوالے سے قرآنی احکام کی روشنی میں، رسول کریمؐ نے کچھ بے مثال معاشی اصلاحات کا نفاذ کیا جن سے تاریخ انسانی پہلے کبھی بہرہ ور نہ ہوئی تھی۔ اگر ہم تاریخ کی کتب سے اس سلسلہ میں استفادہ کریں تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

ا۔ حلال وحرام کا قانون: اکتساب رزق اور دولت کے حصول کے ساتھ ان کے مصارف میں بھی ہدیت الٰہی کے تحت حلال وحرام کی تمیز اور حرام کی سختی سے ممانعت؛ مثلاً رشوت اور خیانت کی ممانعت، قحبہ گری اور رزنا کی آمدنی کو حرام قرار دیا گیا۔ شراب کی صنعت، بت گری و بت فروشی، جواء و سٹہ وغیرہ کی حرمت کو قانونی شکل دے دی گئی۔

۲۔ ارتکاز دولت پر پابندی: مال جمع کرنے کی مذمت اور سرمایہ داری پر پابندی لگائی گئی تاکہ ہوسِ دولت اور دیگر اخلاقی امراض سے معاشرہ پاک رہے، معیشت محنت کش کے لیے کھلی رہے۔

۳۔ اقتصاد کا قانون: یعنی انفرادی و اجتماعی سطح پر خرچ میں کفایت شعاری اور توازن کی کوششیں، فضول خرچی اور بخل کی مذمت و حوصلہ شکنی۔ سرکاری سطح پر عیش پرستی اور شاہ خرچی پر سخت پابندی۔

۴۔ سود کا خاتمہ: رسول اللہ ﷺ نے صدیوں سے جاری سود خوری کی قبیح معاشی بیماری کا خاتمہ قرآنی حکیم نے (البقرۃ) کے ذریعے کیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام سود ساقط کر دیئے۔ آپ ﷺ نے سود لینے اور دینے والے، اس کی دستاویز کے کاتب اور اس پر گواہی دینے والے سب کی سختی سے مذمت کی۔ (۳۷)

۵۔ قانون وراثت کا اجراء: عہد نبوی میں قانون وراثت کا اجراء ہوا اور عورتوں کو وراثت کا آئینی طور پر حقدار قرار دیا گیا جو کہ پہلے نہیں تھا۔ اسی طرح، وصیت اور وقف کے اداروں کی اصلاح وتجدید کی گئی۔

۶۔ زرعی اصلاحات: معدنی دولت اور بے کار زمینوں کو زیر استعمال لانے کے لئے ۔آپ نے فرمان جاری کر دیا کہ: جو شخص کسی زمین کو آباد کرے اور وہ کسی اور کی مملوکہ نہ ہو تو آباد کار اس کا زیادہ حقدار ہے: من أحياء أرضا ليست لأحد فهو أحق بها۔(۳۸)

۶۔معاشرے کی تعمیر واصلاح

مسلمانوں کی نو آبادکاری کا وہ سلسلہ جو ہجرت مدینہ کے ساتھ شروع ہوا تھا، ریاست مدینہ کے قیام اور استحکام کے ساتھ ساتھ جاری رکھا گیا۔مسلمان ہونے والے لوگوں سے اسلام لاتے وقت ہی تقاضا کیا جاتا کہ وہ مدینہ کی اسلامی ریاست میں آکرآباد ہو جائیں اگر پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہوتا اور ان کی رہائش مدینہ کی ریاست سے متصل یا قریب ہوتی تو اسے پھر اپنے ہی وطن میں رہنے دیا جاتا۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل وتعمیر کیساتھ ساتھ اللہ کے رسول نے ثقافتی وتفریحی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا۔تعلیم وتربیت، نوجوانوں کو فنی تخصیص کی ترغیب اور کارکردگی پر انعام و اکرام کا اہتمام فرمایا۔جسمانی ریاضت کے کھیل۔۔تیراکی، کشتی، دوڑ کے مقابلے، نیزہ ونشانہ بازی، تیراندازی اور وزنی پتھر اٹھانے کی مشقیں۔۔۔ان سب کے اہتمام میں رسول اللہ ﷺ کی دلچسپی تاریخ نے محفوظ کی ہے۔(۳۹)

عائلی زندگی کی تطہیر وتجدید

ریاست مدینہ کے نظام معاشرت کا مطالعہ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ رسول خدا نے معاشرے کی بنیادی اکائی، خاندان کے ادارے کو استحکام بخشنے کے لئے، نئے قواعد وضوابط نافذ کئے تھے۔مرد وعورت کے مقدس معاشرتی معاہدے، نکاح کے تفصیلی احکام، نباہ، طلاق اور خلع کے مسائل، میاں بیوی کے باہم حقوق وفرائض اور والدین اور اولاد کے باہمی حقوق وفرائض کی تعیین کی گئی۔اس سلسلے کے تمام تفصیلی احکام قرآن پاک کی سورۃ البقرہ اور النساء میں موجود ہیں، ہم یہاں اختصار سے ان بنیادی اصولوں کا ذکر کرتے ہیں جنکی روشنی میں قرآن نے ایک معاشرتی انقلاب برپا کر دیا تھا:

۱۔مرد وعورت کی پیدائشی بنیاد ایک ہے۔

۲۔اپنے اعمال کے نتائج کے لحاظ سے برابر ہیں، جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں،

۳۔اللہ کی نشانیوں مین سے ہے کہ اس نے تمہارے جوڑے بنائے ہیں جو تمہاری معاشرت میں سکون، محبت اور رحمت کی بنیاد ہیں،

۴۔جسطرح مرد کے حقوق عورت پر ہیں اسیطرح عورت کے حقوق مرد پر ہیں،

۵۔البتہ مردوں کو عورتوں پر گھر کے معاملات میں ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے،وہ خاندان کے معاملات کے نگران ہیں،

۶۔مردوں پر لازم ہے کہ وہ ان سے شایان شان سلوک کریں اور عورتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ گھر سنواریں، جاھلیت اور گمراہی کی تہذیب نہ اپنائیں،

۷۔ دونوں کیلیے لازم ہے شرم وحیا کا دامن تھامے رکھیں اور اپنے خاندان کو پاکیزہ معاشرت کی بنیاد بنائیں،

۸۔عورتوں کو تمام معاشرتی،معاشی اور تمدنی حقوق مکمل شکل میں پہنچائے جائیں،

۹۔خاندان معاشرت کی اکائی ہے، والدین اولاد کو ہلاکت سے بچائیں، رحمت اور شفقت سے انہیں اچھا انسان بنائیں، اور رزق کی تنگی کے ڈر سے انہیں قتل نہ کریں،

۱۰۔ اولاد، والدین کے حقوق کی پاسداری کرے، احسان کا سلوک کرے اور انکے لیے اللہ کی رحمت کی دعا کرے۔(۴۰)

تاریخ انسانی کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کے اندرونی استحکام کیلیئے رسول اللہ کیطرف سے عمل میں آنے والی یہ پہلی کامیاب کوشش تھی جس نے عورت کو محترم مقام دیا اور اولاد کو زندگی کے تحفظ کی ضمانت فراہم کی۔آپ کی نافذ کردہ سماجی اصلاحات سے عورت کے قدرتی حقوق بحال ہوئے۔۔زندگی کے معاشی، معاشرتی اور جنسی پہلوؤں سے تاریخ انسانی میں پہلی دفع اس کے حقوق کا تعین، آئینی تحفظ کے ساتھ ہوا۔قتل اولاد کی قبیح رسم ختم کی گئی، جس کے تحت کبھی مذہبی عقائد کی بنیاد پر نوجوان اولاد کو بھیںٹ چڑھایا جاتا تھا اور کبھی معاشی تنگی کی بنیاد پر بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیا جاتا تھا۔رسول خداﷺ کے قائم کردہ معاشرے میں ان اصلاحات کے نتیجے میں اولاد اور والدین کے درمیان اتحاد، محبت، احترام اور ہم آہنگی کے جذبات پختہ ہو گئے۔

قانون وراثت کا نفاذ

ریاست مدینہ میں قانون میراث وترکہ اور وصیت کے ذریعے معاشرے کے کمزور افراد کے معاشی حقوق منضبط کئے گئے تھے۔ابتدائی پانچ سالوں میں قوانین میراث، پوری تفصیل

کے ساتھ نافذ ہو چکے تھے جن کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے پھر کوئی وصیت اگر اس کی ہو تو پوری کی جائے۔اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی،

۲۔مرنے والا مرد ہو اور اس کی اولاد ہو تو اس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اگر اولاد نہ ہو تو بیوی کو چوتھائی حصہ۔۔میت عورت ہو اور اسکی اولاد نہ ہو تو شوہر کو نصف ترکہ،اگر اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی،

۳۔میت کی (اولاد ہو یا نہ ہو) بھائی بہن ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چٹھا حصہ ملے گا۔بھائی بہن بھی نہ ہوں تو بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی باپ کو ملے گا۔اگر زوجین میں سے کوئی بھی نہ ہو تو سارا ترکہ۔۔۔والدین میں اسی اصول کے تحت تقسیم کر دیا جائے گا،

۴۔والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔مرنے والے کی دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں (اور کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو) تو انہیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اس کے نصف کی حقدار ہوگی۔میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال ان میں تقسیم ہوگا۔لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا،

۵۔اولاد نہ ہونے کی صورت میں میت کے بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہوں گے۔ والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں گے۔ ذکور واناث کے لئے ان حصوں کی تقسیم کا وہی طریقہ ہوگا جو اولاد کے لئے بیان ہوا ہے۔(۴۱)

قوانین میراث کی تاریخ سے واقف بہ آسانی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ،قانون وراثت کی تفصیلات نہ صرف مہیا کیں بلکہ ان پر عمدرآمد کو یقینی بنانے کیلیے رسول خدا کی قائم کردہ ریاست میں ایک عملی نمونہ پیش کیا۔قرآن نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ یہ ضابطہ،اللہ کی قائم کردہ حدود کی حیثیت رکھتا ہے اور انسان کے لیے دنیا وآخرت دونوں زندگیوں میں فلاح اسی سے ممکن ہے۔

حلال وحرام کی تعیین

قرآن نے رسول اللہ ﷺ کا ایک مقام (الاعــــراف ۷: ۱۵۷) یہ بتایا ہے کہ آپ ﷺ بطور رسول اور حاکم یہ اختیار رکھتے ہیں کہ حکم خداوندی کی روشنی میں، افراد معاشرہ کے لئے مأکولات ومشروبات (کھانے اور پینے والی اشیاء) سے لے کر عبادات ومعاملات تک حلال وحرام کی تعیین (پاکیزہ چیزوں کو جائز قرار دینا اور ناپاک چیزوں کو ناجائز قرار دینا) کے ذمہ دار ہیں تاکہ معاشرہ کی تعمیر حکم الٰہی کے تحت ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے ریاست مدینہ میں طیبـــات (جو اپنے ظاہر، باطنی مزاج اور اپنی سرشت کے لحاظ سے پاکیزہ، معتدل، صحت بخش اور نافع ہوں) کو حلال وجائز قرار دیا اور خبیثات (وہ چیزیں جو اپنے مزاج، سرشت اور انسانی طبیعت پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے نقصان دہ اور مفسد ہوں) کو ناجائز اور حرام قرار دیا۔ عرب میں آپ ﷺ سے پہلے یہ تمیز قائم نہ تھی۔ بعض مأکولات کو تو ہم پرستانی رسوم کی بنیاد پر، دسترخوان سے دور رکھا جاتا اور بعض مرداروں اور حشرات الارض تک کو، بغیر کراہت سے کھایا جاتا جبکہ رسول خدا نے تمام درندہ جانور اور پنجہ دار پرندے حرام قرار دیئے گئے۔

شراب نوشی اور سود خوری کو حرما قرار دے کر معاشرے کو ان دونوں مضر صحت اور مضر معیشت عناصر سے پاک کر دیا گیا۔ اسی طرح مرد وعورت کے معاشرتی اور ازدواجی تعلق میں بھی 'مـحـرمـات' کا تعین کیا گیا، جیسا کہ قرآن پاک میں تفصیلی ہدایت موجود ہے۔ (۴۲) رسول اللہ ﷺ نے ان اصولوں کی خلاف ورزی پر موت اور ضبطیٔ جائداد کی سخت سزائیں دیں۔

قرآن نے اسلامی ریاست کی لازمی خصوصیت (ال عـمـران ۳: ۱۰۴) یہ قرار دی ہے کہ اس کا کام معاشرے میں اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے لوگوں کو روکنا ہے۔ اسی طرح یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ اسلامی اجتماعیت کا ایک حصہ اسی کام پر مسلسل لگا رہے کہ وہ معروف (اخلاقی فضائل) کا نفاذ عام کرے اور منکر (اخلاقی رذائل) کو روکنے کا اہتمام کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی ریاست میں صیغۂ احتساب کے تحت اس کا اہتمام کیا کہ لوگوں کے اخلاق کی نگرانی واصلاح کا کام کیا جائے، حکام کی تربیت اور ان کے محاسبے کا مسلسل انتظام ہو اور لوگوں کو مذہبی فرائض کی ادائیگی پر ابھارا جاتا رہے اور منفی سرگرمیوں پر سرزنش کی جاتی

رہے۔اس سلسلہ میں عملی اقدامات یہ کئے کہ عمال کی تقرری میں باصلاحیت، بے لوث، باکرداراور مخلص افراد کو ترجیح دی۔تجارتی بدعنوانیوں کے انسداد کا اہتمام کیا۔آپ خود بازاروں اور منڈیوں کادورہ کر کے ایسے معاملات کی چھان بین کرتے۔تنبیہ اور ضروری کاروائی ہوتی۔

ناپ تول میں کمی، دھوکہ وفریب نرخوں میں بے جا اضافے۔۔ایسی چیزوں پر تجار کا احتساب کیا جاتا۔آپ ﷺ نے بازار کے محتسب بھی مقرر کئے۔بعض اوقات عورتیں بھی کوڑا لے کر گھومتیں اورامر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتیں۔(۴۳)

حدود وتعزیرات کا نفاذ

رسول خدا ﷺ نے معاشرے کو تخریب اور تباہی کی طرف لے جانے والے جرائم سے پاک کرنے کے لئے قرآن کریم کی ہدایات کی روشنی میں جن عبرتناک سزاؤں کا نفاذ کیا وہ اسلامی اصطلاح میں 'حدود' کہلاتی ہیں۔

لفظ'حد 'لغوی اعتبار سے'الحاجز بین الشیئین '(دوچیزوں کے درمیان حدفاصل کے طور پرآ جانے والی چیز'' کا نام ہے جبکہ فقہاء کی زبان میں اسے'عقوبۃ مقدرۃ تجب حقا للہ '(اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہو جانے والی سزا) کہتے ہیں۔(۴۴)انسانی اجتماعیت میں فتنے کا باعث بننے والے بڑے جرائم کی سزاؤں کے لئے'حدود'(اللہ کی متعین کردہ سزاؤں) کا نفاذ ہوتا ہے۔باقی جرائم کی سزائیں قاضی کی صوابدید کے تحت عمل میں لائی جای ہیں جنہیں 'تعزیرات ' کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے انسان کے قتل کو انسانیت کا قتل قرار دیا ہے اوراس کا ارتکاب کرنے والے سے بدلے کی حد'قصاص 'مقرر کی ہے۔۔۔قتل وغارت،اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کے خلاف بغاوت اور فتنہ وفساد کے مرتکب افراد کے لئے قرآن نے موت یا جلاوطنی کی سزا مقرر کی ہے۔علاوہ ازیں جو جرائم قابل حد قرار دیئے گئے ہیں ان میں زنا، ارتداد، قذف (زنا کی تہمت لگانا) شراب نوشی، چوری، ہم جنسی، بغاوت، رہزنی، جانوروں کے ساتھ مباشرت وغیرہ شامل ہیں۔رسول خدا ﷺ نے، قصاص کے ۲۷، حدود کے ۱۸، چوری کے ۱۵،شراب نوشی کے ۸، اورقذف کے ۲ فیصلے صادر فرمائے۔(۴۵)

حاکم مدینہ نے ناقابل معافی جرائم میں جس طرح سخت سزائیں نافذ کیں اس سے

بڑھ کر اس بات کا اہتمام فرمایا کہ ایک طرف تو بے لاگ انصاف کا دامن کہیں بھی نہ چھوٹے اور دوسری طرف حد کے اجراء میں حد درجہ احتیاط برتی جائے۔

۷۔ امور خارجہ ودفاع

ریاست مدینہ کا مطالعہ امور خارجہ اور امور دفاع کے حوالے سے بھی منفرد اصول سامنے لاتا ہے۔ اسوۂ رسولؐ سے دور جدید کے حوالے سے جو فکر انگیز روشنی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی خارجہ پالیسی میں امن، صلح اور بین الاقوامی معاہدوں کو بنیاد بنایا۔ آپؐ نے دوست بڑھانے اور دشمن کم کرنے پر توجہ رکھی۔ اگر کسی ناگزیر جنگ کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں سے امن وسلامتی کے سارے ممکنہ ذرائع کو پہلی ترجیح میں رکھا۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کے گرد، رسول خدا ﷺ نے ابتداء ہی سے ایک دفاعی حصار قائم کر لیا تھا اس طرح مدینہ کی منتشر آبادی کو ایک مرکزی حکومت کے تحت آ گئی۔ اس سلسلہ میں آپ نے درج ذیل اقدام کیے:

۱۔ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی مدینے کے جنوب مغربی حصے اور ساحل سے ملے ہوئے علاقوں میں، آپ بار بار تشریف لے گئے اور قبائل جہینہ، بنی ضمرہ، بنو مدلج، بنو غفار، بنی مزینہ، بنو عامر، بنو خزاعہ، بنو اسلم، قضاعہ وغیرہ سے دفاعی وسیاسی معاہدے کئے گئے۔ معروف معاہدوں میں معاہدہ جہینہ، معاہدہ حدیبیہ، معاہدہ ثقیف، دومۃ الجندل اور معاہدہ نجران شامل ہیں۔ (۴۶)

۲۔ بعض معاہدوں میں کچھ قبائل نے حضور ﷺ کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنا قبول کیا، بعض قبیلے غیر جانبدار رہنے پر تیار ہوئے اور بعض کے ساتھ، کسی بھی حلیف پر حملہ ہونے کی صورت میں مشترکہ دفاع کا فیصلہ قرار پایا۔ اس طرح دشمنوں میں کمی اور دوستوں میں اضافے کی حکمت عملی اپنا کر رسول اللہ ﷺ نے خارجی امور کو اپنے حق میں کر لیا۔

۳۔ امور خارجہ یعنی بیرون ممالک سے خط وکتابت، سفارت کاروں کا تقرر اور معاہدات وغیرہ کے لئے باقاعدہ ایک شعبہ قائم کیا گیا جس کا کام ان معاملات کی نگرانی کرنا تھا۔ اس شعبہ میں غیر ملکی زبانوں کے ماہرین، مترجمین، ترجمان اور قلمکار شامل تھے جن میں عبداللہ بن ارقم اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۴۷)

۴۔امور خارجہ اور نبوی سیاست کا شاہکار، صلح حدیبیہ ہے جسے قرآن فتح مبین اور نصر عزیز(الفتح ۴۸: ۱، ۳) قرار دیتا ہے۔اس معاہدے میں بظاہر، مسلمان قریش کی منہ مانگی شرائط قبول کرتے گئے، جس پر کئی صحابہ نے بے چینی کا اظہار بھی کیا مگر آخر کار اس سے جو فوائد حاصل ہوئے وہ نگاہ نبوّت سے پوشیدہ نہیں تھے،لہٰذا آپؐ نے ایک طرف اس کے ذریعے امن و امان کی ضمانت حاصل کر لی دوسری طرف قریش کے سارے مطالبے مان کر ان کی مخالفت کے سارے ہتھیار بیکار کر دیے۔اسطرح یہ معاہدہ، اشاعت اسلام اور فتح مکہ کا پیش خیمہ بن گیا۔

۵۔۶ اور ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور قبائلی سرداروں کے نام خطوط اور رسائل فرمائے۔آپکی سرکاری دستاویزات کی تعداد تقریباً سوا دو سو تک ہے۔حبشہ کے نجاشی، بازنطینی حکمران، قیصر، ہرقل، ایرانی بادشاہ خسرو پرویز، بحرین کے حاکم منذر اور مصر کے مقوقس کے علاوہ کئی حکمرانوں کو خطوں میں یہ واضح کیا کہ اسلام کے نظام حیات سے وابستہ ہو جانے میں بھلائی، عزت اور سلامتی ہے۔مثال کے طور پر قیصر روم کے نام آپ کا مکتوب ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ من محمّد عبداللہ و رسولہ الیٰ ہرقل عظیم الرّوم، سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ،امّا بعد فانّی ادعوك بدعا یۃ الاسلام،اسلم تسلم یوتك اللہ اجرك مرتین فان تولیت فان علیك اثم الا ریسین و یااھل الکتاب تعالو الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم الّا نعبد الّا اللہ و لا نشرك بہ شیئاًو لا یتّخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولّوا فقولوا اشھدوا بانّا مسلمون ہ(۴۸)

۶۔رسول اللہ ﷺ حسب ضرورت سفارتوں کا تبادلہ کرتے رہتے مثلاً سفارت بنی ثقیف، بنی تمیم، بنی سعد، بنی طے اور بنی زبید وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔اسی طرح امراء وملوک کو تحائف روانہ کرتے۔دیگر ریاستوں کے سفارت کار آتے تو ان کا استقبال، عزت و تکریم اور مہمان نوزی کا اہتمام ہوتا۔(۴۹)

۷۔مؤرخین نے ۹ھ کو 'سنۃ الوفود'یا'عام الوفود' کا نام دیا ہے(۵۰) کیونکہ ۸ھ میں فتح مکہ کی عظیم الشان کامیابی کے بعد ہر جانب سے مختلف قبائل کے وفود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔قرآن نے سورۃ النصر میں اس حقیقت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ان وفود کے ذریعے اسلامی دعوت اور ریاست کا تیزی سے پھیلاؤ شروع ہو گیا۔

۸۔قرآن مجید میں سرکاری اہتمام کے تحت اخراجات کی جو مدات مقرر کی گئی ہیں ان میں محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ ایک اہم مد 'مولفة القلوب' بھی دی گئی ہے۔(التوبہ ۹ : ۶۰) لہذا لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے سرکاری خزانے میں سے ایک حصہ مختص کرنا، اسلامی سیاست کا ایک اہم اصول رہا ہے۔ فتح مکہ سے قبل قحط پڑنے پر اہل مکہ کو رسول اللہ ﷺ نے پانچ سو اشرفیوں کی امداد روانہ کی تھی۔اسی طرح مدینہ کی اسلامی ریاست میں نومسلموں کو بڑے بڑے انعام و اکرام دیئے جاتے، ان کے اعزاز ملحوظ رکھے جاتے اور ہر طرح ان کو محسوس کرایا جاتا کہ صرف روحانی اور اخروی ہی نہیں، دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی ان کا جدید مذہب ان کے لئے سراسر مفید ہے۔(۵۱)

دفاعی منصوبہ بندی اور آداب جنگ

مدنی زندگی کے دس سالوں میں اسلامی ریاست کے ارتقاء کے دوران رسول خدا ﷺ نے قرآن کی روشنی میں مندرجہ ذیل اصولوں پر دفاعی منصوبہ بندی کی بنیاد رکھی:(۵۲)

۱۔ انسانی جان کا احترام
۲۔امن، انصاف اور قانون کی بالادستی
۳۔نظام تمدن کی حفاظت
۴۔ اجتماعی فتنے کا استیصال
۵۔ظلم وتعدی کا مؤثر جواب
۶۔مدافعانہ ومصلحانہ جنگ
۷۔راہ حق کی حفاظت
۸۔ناحق خوں ریزی سے اجتناب
۹۔مظلوم مسلمانوں کی حمایت
۱۰۔ اسلامی ریاست کا تحفظ

ان زریں اصولوں کی بنیاد پر آپ ﷺ نے مصالحانہ اور مدافعانہ جہادی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ایسی مہمات کی کل تعداد اٹھاسی کے قریب بنتی ہے جن میں سے ستائیس یا اٹھائیس میں آپ ﷺ خود شریک ہوئے، نو غزوات میں جنگ ہوئی اور باقی اٹھارہ میں تلوار کے استعمال کا موقع ہی نہیں آیا۔ بقیہ ساٹھ مہمات میں صحابہ کرام کو سپہ سالار بنایا گیا۔ان مہمات میں مؤرخین نے ان وفود کو بھی شامل کیا ہے جو دشمن کا حال معلوم کرنے، مصالحانہ کوشش کرنے، دشمن پر رعب ڈالنے یا مدافعانہ حکمت عملی کے اظہار کے لئے روانہ کئے گئے تھے۔(۵۳)

تمام لڑائیوں میں مخالفین کے قیدیوں کی کل تعداد ۶۵۶۴ بنتی ہے۔ان اسیران میں سے ۶۳۴۷ کو بغیر کسی شرط کے، اور ۲۰۷ کو فدیہ ادا کرنے پر رہا کر دیا گیا۔صرف دو کو ثابت شدہ

مقدمہ قتل کے نتیجے کے طور پر قصاص میں قتل کیا گیا۔کل مقتولین کی تعداد ایک ہزار چودہ (۲۵۵ مسلمان شہداء اور ۷۵۹ مخالفین مقتول) بنتی ہے جن میں نصف مسلمانوں کے اور نصف مخالفین کے تھے۔(۵۴) تقریباً ۸ سال کی مہماتی زندگی میں تقریباً ہر مہینے میں ایک معرکہ درپیش رہا، جبکہ ہر ایک جنگ میں اوسطاً ۱۰ افراد کام آئے۔

اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ جب کسی کو سپہ سالار بنا کر بھیجتے تو اسے ہدایت فرماتے کہ دشمن کے سامنے تین چیزیں پیش کرنا اول اسلام، دوسرے جزیہ، تیسرے جنگ۔اگر وہ اسلام قبول کر لے تو پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔اگر جزیہ دے کر اطاعت قبول کر لے تو اس کی جان ومال پر کسی قسم کی تعدی نہ کرو لیکن اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو اللہ کی مدد مانگ کر جنگ کرو۔

داعئ اسلام نے محاربین (Belligerents) کو دو طبقوں میں تقسیم کیا: اہل قتال ۔۔جو عملاً جنگ میں شریک یا جنگ کرنے کے قابل افراد، غیر اہل قتال ۔۔عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، معذور، زخمی، مجنون، مذہبی راہنما اور بے ضرر لوگ ۔۔۔اور یوں رسول خدا نے جنگ برائے جنگ کے تصور کو جنگ برائے امن میں تبدیل کر دیا۔تاریخ انسانی جنگوں کی خونی تاریخ سے بھری ہوئی ہے اور فاتح کا دشمن کی فوج کے حوالے سے جو رویہ رہا ہے اگر آج بھی ہم مطالعہ کریں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اس حوالے سے بھی رسول خدا کا اسوہ منفرد نظر آتا ہے جو انسانیت کی تباہی کی بجائے انسانیت کی حفاظت کا زریں اصول پیش کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں جو اصلاحات متعارف کروائیں، جنگوں کی تاریخ میں کہیں ایسے اصولوں کا سراغ تک نہیں ملتا، جیسے مثال کے طور پر آپ کی درج ذیل ہدایات: (۵۵)

۱۔غفلت (یا رات کے وقت نیند) کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز۔

۲۔غیر اہل قتال اور مطالبہ کرنے والوں کو امان۔

۳۔باندھ کر تکلیفیں دے دے کر دشمن کو مارنے پر پابندی۔

۴۔لوٹ مار حرام

۵۔تباہ کاری اور فساد انگیزی سے اجتناب۔

۶۔ آگ میں جلانے کی ممانعت۔

۷۔ مثلہ (لاشوں کی بے حرمتی اور اعضاء کی قطع وبرید) کی ممانعت۔

۸۔ اسیران جنگ، سفیروں، قاصدوں اور نمائندوں کے قتل کی ممانعت۔

یہ تھی رسول رحمت کی جنگی حکمت عملی! اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق ملاحظہ ہو:

عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل سے زیادہ کا علاقہ فتح ہوا۔ جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کے ماہانہ دو سے بھی کم آدمی قتل ہوئے جبکہ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے' أنا نبي الرحمة أنا نبي الملحمة '۔۔۔اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ دشمن کے ستر آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے! (۵۶)

انسانی دنیا ہمیشہ، صدیوں پر محیط بے مقصد خونریزی اور عصبیتوں کی بنیاد پر ہونے والی ہولناک تباہیوں کا شکار رہی ہے۔۔ محمد رسول اللہ ﷺ جس دین کو لے کر آئے اس نے ناگزیر جنگ کو ایک پاکیزہ مقصد کے ساتھ وابستہ کر کے 'جہــــاد' کا نام دیا اور یوں انسانی تاریخ میں 'انسانیت کی محافظ' جنگوں کا بے مثال باب رقم کیا۔ انسانی لڑائیوں کو وحشیانہ بربریت سے پاک کر کے، جنگ کو انصاف کے حصول، ظلم کے استیصال اور فتنہ وشر کے خاتمہ کا ذریعہ بنادیا۔

حاصل مطالعہ

رسول آخر الزماں ﷺ کی بعثت سے چھ صدیاں قبل اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آسمانی بادشاہت کا مژدہ جانفزا سنایا مگر یہودیت کے اجارہ دار طبقہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے اور ان کی دعوت کی تبلیغ کرنے والے یونان وروما تک پہنچے اور پانچویں صدی عیسوی میں عیسائیت کو سلطنت روما کا سرکاری مذہب قرار دلانے میں کامیاب بھی ہو گئے مگر آسمانی بادشاہت کا خواب اسلیے تشنۂ تکمیل رہا کہ عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات صدیوں کے سفر میں کھو گئیں اور سینٹ پال کی مسیحیت رومی ملوکیت کی خوشہ چیں ہو گئی۔

پانچویں صدی کے مشہور عیسائی مفکر سینٹ آگسٹین (St Augustine) نے خدائی ریاست City of God کے نام اور تصور کیساتھ لاطینی زبان میں ایک کتاب لکھی جو قرون

وسطیٰ کی مغربی تہذیب پر گہرے اثرات رکھنے کے باوجود عملاً کسی آسمانی بادشاہت کے قیام میں مدد نہ دے سکی۔ اس کتاب نے انسانی ریاست اور خدائی ریاست کا فرق بیان کرنے کی کوشش کی مگر دین و دنیا اور مذہب و ریاست کی تفریق کو ختم نہ کر سکی اور آخرت کی زندگی میں خدائی ریاست کی عملداری کے تصور تک محدود رہی، اور یوں دنیا کی زندگی میں انسانی فلاح کا کوئی جامع منصوبہ اور عملی نمونہ پیش نہ ہو سکا۔

رسول آخر الزماں ﷺ نے قرون وسطیٰ کے اس دور ظلمت کو روشنی میں بدل دیا اور قرآن مجید کی ہدایات الٰہی کی روشنی میں ایک ایسی مثالی ریاست مدینہ میں قائم کی جو ایک نئے تہذیب و تمدن کی بنیاد بنی اور رہتی دنیا تک کے لیے مثال بن کے سامنے آئی۔ دس سال کے عرصہ میں تین مربع میل کے رقبہ سے بڑھ کر دس لاکھ مربع میل کے علاقے کو اپنے محیط میں لینے والی اس ریاست نے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں جن کی تفصیل ہم نے ایک مختصر تحقیقی مطالعے کی شکل میں پیش کی ہے۔ انتظام ریاست کے نبوی منہج کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال گذر جانے کے باوجود وہ اصول ریاست جو رسول خداؐ نے انسانیت کو عطا کیے، آج بھی تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہیں اور ہر شعبہء زندگی میں مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔

آپ ﷺ نے ریاست کے اندرونی معاملات میں جہاں قانون کی بالادستی، عدل و انصاف کی فراہمی، تہذیب و تمدن کی تعمیر و تطہیر اور فلاحی معاشرے کے قیام پر زور دیا وہاں ریاست کے بیرونی اور خارجہ معاملات میں بھی انسانیت کی حفاظت اور امن و سلامتی کو ترجیح اول بنایا۔ صلح کے ساتھ ساتھ جنگ کے آداب، اس میں اخلاقی حدود و قیود، محاربین کے باہم حقوق و فرائض، مقاتلین اور غیر مقاتلین کی تمیز اور ان کے حقوق، معاہدین اور اسیران جنگ کے ساتھ برتاؤ اور مفتوح قوموں کے ساتھ سلوک کے لئے واضح راہیں متعین کر دیں۔ اس طرح نہ صرف جنگ کے مقاصد تبدیل ہوئے بلکہ طریق جنگ بھی مکمل طور پر بدل گیا۔ جنگ میں ہر چیز جائز ہے، پر ایمان رکھنے والی خونخوار انسانیت کو، آپ ﷺ نے 'آداب جنگ' سکھا دیئے۔

اسوۂ رسولؐ سے دور جدید کے حوالے سے جو فکر انگیز روشنی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے سماج اور اپنی خارجہ پالیسی میں رواداری، امن اور صلح و سلامتی کے بین الاقوامی معاہدوں کو بنیاد بنایا۔ آپؐ نے انسانوں کو تقسیم کرنے کی بجائے ملت آدم کے قیام پر توجہ مرکوز رکھی۔ اگر کسی

ناگزیر جنگ کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں سے امن وسلامتی کے سارے ممکنہ ذرائع کو پہلی ترجیح دی۔مکی زندگی میں تشدد اور ظلم کے مقابلے میں صبر اور برداشت کا دامن نہیں چھوڑا، مدنی دور کے آغاز سے پہلے بیعت عقبہ کا معاہدہ کیا، قریش مکہ کے رویے کے خلاف کسی پرتشدد ردعمل کی بجائے ہجرت کا راستہ اختیار کیا، مدینہ پہنچ کر میثاق مدینہ سمیت حلفی کے کئی معاہدے کیے، غزوۂ حدیبیہ کا انجام ایک بے مثال صلح کی صورت میں یقینی بنایا اور فتح مکہ کے موقع پر عفو ودرگذر اور امان دینے کے اصولوں کی مدد سے انسانیت کو جنگ کے خوفناک نتائج سے بچالیا۔ بلاشبہ ریاست اسلامی کی تشکیل، استحکام اور ترقی کے یہ سنہرے اصول ایک لائحہ عمل پیش کرتے ہیں ان تمام اہل اخلاص کے لیے جو آج اسلامی ریاست کے قیام کے لیے سرگرم ہوں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ تفصیل کیلئے دیکھیے: امام بخاری، محمد بن اسمٰعیل ، الجامع الصحیح (دارالسلام، ریاض۔۱۹۹۷ء)
کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبیؐ، حدیث: ۳۸۹۷ اور ۳۹۰۵

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی (اردو اکیڈمی، کراچی۔۱۹۸۷ء): ۲۶۳۔۲۸۲

۳۔ محمد ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (دارالفکر، بیروت۔۱۹۹۴ء): ۱/۱۶۱،

4, 5. Philip K. Hitti, *History of the Arabs,* (NewYork-1968) p: 139-40, 116

۶۔ امام احمد بن حنبل، المسند (دارالاحیاء التراث العربی، بیروت۔۱۹۹۱ء): ۶/۴۲۶، شبلی نعمانی، سیرۃ النبی (لاہور۔۱۹۹۱ء): ۱/۲۶۵۔۲۶۷،

۷۔ عبدالملک ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (مصطفیٰ البابی، مصر۔۱۹۳۶ء) : ۱/۱۱۲،

۸۔ محمد اسلم ملک، مدینہ کی قدیم تاریخ: نقوش، لاہور۔۱۹۸۴ء، رسول نمبر): ۲/۴۴۰
ابوایوب انصاریؓ کے اس مکان کے بارے میں ایک دلچسپ بات ہے۔ مؤرخین کے مطابق،

حضرت ابوایوب انصاریؓ کو یہ مکان، خاندانی وراثت میں ملا تھا۔ یمن کا بادشاہ تبع بن اسعد ۷۰۰ سال قبل اسلام، ممالک شرقیہ کی تسخیر کرتے ہوئے یثرب میں بطور فاتح داخل ہوا۔ یہودی علماء کی اس پیشگوئی پر کہ یہ شہر نبی آخر الزمان ﷺ کا دارالھجرت بنے گا، اس نے نہ صرف اس شہر کو امان دی بلکہ مکہ میں کعبۃ اللہ پر غلاف (غالباً سب سے پہلا) چڑھانے کے لئے حاضری دی۔ محمد بن اسحاق کے مطابق شاہ تبع نے نبی آخر الزماں کے لئے ایک شاندار محل بنوایا اور ایک سربمہر تحریر آپ ﷺ کے نام چھوڑی اور اسے نسل درنسل منتقل کرنے کی وصیت کی۔ ابو ایوب کو یہ محل اور خط اسی طرح وارثت میں ملا اور انہوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ شاہ تبع کے خط میں نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کی شہادت واضح اقرار کی صورت میں موجود ہے۔ (سید سلیمان ندوی، ارض القرآن (معارف پریس، اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء)

۹۔ تفصیل کیلئے دیکھیں:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم کے میدان جنگ: (مکتبہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) : ۱۸ تا ۲۳

۱۰۔ البلاذری، احمد بن یحیٰ، فتوح البلدان (نفیس اکیڈیمی۔ کراچی، ۱۹۸۶ء) : ۲۲، ۲۸، ۲۹،

۱۱۔ محمد ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱(II) / ۷۲

تاریخی تحقیق نے جو قدیم ترین دساتیر دریافت کیے ہیں ان میں دستور مدینہ جدید تر، جامع اور محفوظ ہونے کے اعتبار سے بہت نمایاں مقام رکھتا ہے۔ قدیم سمیری تہذیب (عراق) کی شہری ریاست لاگاش کا قانون جو کہ اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کی دستاویز ہے، مکمل دستیاب نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں:

(Walter Wink, *The Powers* (Fortess Press-1992)

اسی طرح بابل کے حکمران حمورابی کا دستور جو دو ہزار قبل مسیح میں رائج تھا، مکمل اور جامع تحریری صورت میں محفوظ نہیں ہے، صرف چند قوانین پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے ملے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں:

(R. F. Harper, *Code of Hammurabi* (University of Chicago Press-1904)

تاہم مشہور رومن لاء جو کہ آپ کی بعثت سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل مکمل شائع ہو چکا تھا مگر اس کے ارتقاء اور تکمیل میں تین صدیاں صرف ہوئیں۔ تفصیلی تجزیے کے لیے دیکھیں:

(W. Buckland, *A Textbook of Roman Law*
(Cambridge University Press- 1993)

۱۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی: ۸۱ ، ۷۵تا۹۶

مولانا صفی مبارکپوری لکھتے ہیں: اس معاہدہ کے ذریعے سے مدینہ اور اس کے اطراف کی ایک وفاقی حکومت بنی جس کا دارالحکومت مدینہ تھا اور جس کے سربراہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ جس میں کلمہ نافذ اور غالب حکمرانی مسلمانوں کی تھی۔ اس طرح مدینہ واقعۃً اسلام کا دارالحکومت بن گیا۔ (الرحیق المختوم، لاہور۔۱۹۹۵:۲۱۹)

۱۳۔ امام احمد بن حنبل، المسند: ۱/۷۰۹

۱۴۔ امام راغب اصفہانی، المفردات (مصر۔۱۳۰۴ھ) :۱۳۴۔۱۳۵

۱۵۔ عبدالملک ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۳۰،

۱۶۔ امام مسلم بن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح (بیروت۔۱۹۸۱ء): کتاب الایمان:۶۳،

۱۷۔ امام ابوداؤد السجستانی، السنن (بیروت۔۱۹۸۱ء):۲/۴۰۷ ،

علامہ شبلی نعمانی نے زرقانی کے حوالے سے رسول کریمؐ کے مقرر کردہ عمال صحابہؓ کی درج ذیل فہرست مہیا کی ہے:

باذان بن ساسانؓ (یمن) شہر بن باذانؓ (صنعاء) المخزومیؓ (کندہ وصدف) زیاد بن لبیدؓ (حضرموت) ابوموسیٰ اشعریؓ (عدن وغیرہ کا علاقہ) معاذ بن جبلؓ (جند) عمر بن حزمؓ (نجران) یزید بن ابی سفیانؓ (تیماء) عمر بن العاصؓ (عمان) علاء بن حضرمیؓ (بحرین) اور علی بن ابی طالبؓ (متولی اخماس یمن) (سیرۃ النبیؐ حصہ دوم (اعظم گڑھ۔۱۳۶۹ھ):۶۷،۶۸)

۱۸۔ البلاذری، فتوح البلدان:۳۰ تا ۳۵،

مؤرخین اور سیرۃ نگاروں نے ان محصلین کی فہرست دی ہے، مثال کے طور پر دیکھیں شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، محولہ بالا:۷۳

۱۹۔ امام راغب اصفہانی، المفردات:۵۴۔۲۵۳،

۲۰۔ ابن ہشام، السیرۃ : ۱/۳۴۱۔۳۴۴،

امام ابوعبید، قاسم بن سلام، کتاب الاموال (مصر۔۱۹۸۱):۹۷۔۱۹۳

۲۱۔ ابن ہشام، السیرۃ : ۱/۹۵۔۲۹۳، ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی:۱۵۸،

سیرۃ نگاروں نے لکھا ہے کہ رسول کریمؐ کی تجویز پر بارہ نقباء کا تقرر کیا گیا جن میں سے نو افراد

قبیلہ بنوخزرج اور تین افراد قبیلہ اوس سے لیے گئے۔نقباء کے نام درج ذیل ہیں:
اسعدؓبن زرارہ، سعدؓبن ربیع، عبداللہؓبن رواحہ، رافعؓ بن مالک، براءؓبن معرور، عبداللہؓبن عمرو، عبادہؓبن صامت، سعدؓبن عبادہ، منذرؓبن عمرو، اسیدؓبن حضیر، سعدؓبن خثیمہ، رفاعہؓبن عبدالمنذر (ابن ہشام، السیرۃ: ۴۴۴/۱)

۲۲۔ ابن ہشام، السیرۃ: ۶۲/۲۔۹۶۱، شبلی، سیرۃ النبی: ۲۶/۱،
۲۳۔ علامہ ابن رشد، بدایۃ المجتہد (مصر۔۱۳۳۹ھ): ۲۹۷/۲،
امام ترمذی، السنن (دارالفکر، بیروت۔۱۹۸۱ء): ۱۵/۲،
امام ابویوسف، کتاب الخراج (بیروت۔۱۹۷۹ء): ۱۳،
۲۴۔ امام ترمذی، السنن: ۱۳/۵، امام ابوداؤد، السنن: ۲۳/۶،
امام بخاری، الجامع الصحیح (دارالاحیاء التراث العربی، بیروت۔۱۹۸۵ء): ۴۸/۶
۲۵،۲۶۔ ابن ہشام، السیرۃ: ۴۴۴/۲، ابن اثیر، الکامل (دمشق۔۱۳۵۶ھ): ۲/ ۲۴۱،
ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی: ۱۷۵، ابویوسف، کتاب الخراج: ۱۱۶
۲۷۔ ابن ہشام، السیرۃ: ۸۸/۲۔۱۸۳
۲۸،۲۹۔ ابن اثیر علی بن احمد، الکامل فی التاریخ (دمشق۔۱۳۵۶ھ): ۲۴۱/۲،
ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی: ۱۷۵
۳۰۔ ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی (دارالاشاعت، کراچی۔۱۹۸۷ء): ۱۰۶
۳۱۔ متن قرآن سے استفادہ کے لیئے دیکھیں:
البقرہ: ۲۹، الزخرف: ۳۲، الجمعہ: ۱۰، البقرہ: ۶۰، ہود: ۶، النجم: ۳۹، القصص: ۷۷،
البقرہ: ۱۶۸، ۱۸۸، التوبہ: ۳۴، ۳۵، الاعراف: ۳۱، المعارج: ۲۵، البقرہ: ۳۶، التکاثر: ۸
۳۲۔ امام ابویوسف، کتاب الخراج: ۲۰،
۳۳۔ امام بخاری، الجامع الصحیح (بیروت۔۱۹۸۵ء): ۴۳۶/۱،
البلاذری، فتوح البلدان: ۲۴ تا ۲۶
ابوعبید، کتاب الاموال: ۷۷۔۷۶، شبلی نعمانی، سیرۃ النبی: ۸۳/۲
۳۴۔ امام ابویوسف، کتاب الخراج: ۱۷۷،
۳۵۔ ابن سعد، طبقات: ۱۶۹/۱

۳۶۔ امام ترمذی، السنن: ۳۱/۲

۳۷۔ اس سلسلہ میں قرآنی ہدایات کے لئے دیکھیے:
البقرہ: ۱۸، ۲۸۳، المائدہ: ۹۰، النور: ۲۔۲۳
الھمزہ، آل عمران بلصوا ۱۸، التوبہ: ۳۴، بنی اسرائیل: ۲۹

۳۸۔ امام بخاری، الجامع الصحیح (بیروت۔۱۹۸۵ء)، کتاب الوصایا: ۲۸۲/۱ تا ۳۹۰، ۳۱۴
ابن سعد، طبقات: ۲۶۸/۱، ابوعبید، کتاب الاموال: ۲۶۴

۳۹۔ ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی: ۷۲۔۲۶۸،

۴۰۔ یہ اصول درج ذیل آیات سے ماخوذ ہیں:
النساء: ۱، ۲، ۳۲، ۱۲۴، الروم: ۲۱، النحل: ۲، ۷۲، البقرہ: ۲۲۸، النساء: ۳۴، ۱۹، الاحزاب: ۳۳،
النور: ۳۰، ۳۱، النساء: ۷، البقرہ: ۲۳۷، تحریم: ۶، الاعراف: ۳۱، الاسراء: ۲۱، ۲۳، ۲۴،
البقرۃ: ۱۸۷، ۲۳۱، ۲۳۳، النساء: ۴، ۳۶، ۱۲۹

۴۱۔ اس سلسلہ میں نصوص قرآنی ملاحظہ ہوں: النساء۴: ۷۔۱۳، ۱۷۶،

۴۲۔ ملاحظہ ہوں قرآنی آیات: المائدۃ: ۳، النساء: ۲۳، الحج: ۴۱، آل عمران: ۱۰۴،

۴۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی: ۱۷۶

۴۴۔ البستانی، محیط المحیط (بیروت۔۱۹۷۰ء): ۳۵۸،

۴۵۔ نصوص قرآنی کیلئے ملاحظہ ہو: المائدۃ: ۳۲، البقرۃ: ۱۷۸، المائدۃ: ۳۳
تفصیل کیلئے دیکھیں: ابن حجر، فتح الباری (مصر۔۱۹۵۹ء): ۶۱/۱۵،

۴۶، ۴۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، الوثائق السیاسیۃ (بیروت۔۱۹۸۵ء): ۱۴، ۳۶، ۸۰ تا ۸۲

۴۸، ۴۹۔ ابن سعد، طبقات: ۳۲۸/۱۔۲۹۹

۵۰، ۵۱۔ امام شمس الدین سرخسی، المبسوط (بیروت۔۱۹۸۹ء): ۹۲/۱۰،
ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی: ۲۵۹

۵۲۔ یہ اصول درج ذیل آیات قرآنی سے ماخوذ ہیں:
المائدۃ: ۳۲، ۶۴، آل عمران: ۱۔۴، ۱۱۰، الانفال: ۵۵ تا ۵۸، ۶۰، البقرۃ: ۹۴۔۱۹۰،
الحج: ۳۹، ۴۰، ۴۱، محمد: ۴، النساء: ۷۵، ۹۱، احزاب: ۶۰، ۶۱

۵۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی: ۲۴۴

۵۴۔ قاضی سلمان منصور پوری، رحمۃ اللعالمین (شیخ غلام علی سنز، لاہور۔۱۹۴۶ء):

۲/۲۶۵،
نعیم صدیقی، محسن انسانیت (الفیصل ،اردو بازار لاہور۔۲۰۰۳ء): ۳۴۸
۵۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام (ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۹۵ء): ۹۸۔۲۱۶
۵۶۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی: ۲۴۴

باب چہارم

خلافت راشدہ اور اس کے معاشرتی اثرات

۶۲۲ء میں رسول خدا جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے مدینہ میں جو ریاست اسلامی قائم کی تھی وہ دس سال کے عرصہ میں ایک غیر معمولی رفتار کے ساتھ مثالی وسعت اختیار کرگئی۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ کے، اس ریاست میں دس سال تک، اوسطاً ۲۷۴ مربع میل روزانہ کے حساب سے اضافہ ہوتا رہا۔(۱)

۶۳۲ء میں رسول خدا کے، اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد، اس ریاست نے خلافت راشدہ کے نام سے ترقی پانا شروع کی۔ اردگرد کی، جبر و استبداد پر قائم ریاستیں اور ان سے تنگ آئے ہوئے معاشرے، سال بہ سال، خلافت راشدہ کا حصہ بنتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسلامی ریاست دنیا کے تین براعظموں تک اپنے اثرات رکھنے والی ایسی ریاست بن گئی جس کا رقبہ ۳۰ لاکھ مربع کلومیٹر سے تجاوز کرگیا۔ اس حقیقت کو فلپ حتی نے یوں تسلیم کیا ہے:

Within a century after their rise, this people became the masters of an empire, extending from the shores of the Atalantic Ocean to the cinfines of China, an empire greater than that of Rome at its zenith.(2)

جمہوریت اگر اقتدار میں عوامی نمائندگی، شوریٰ و مشاورت، حقوق و فرائض کی ادائیگی اور آزادیٔ رائے کا نام ہے تو خلافت راشدہ سے بڑی اور نمایاں کوئی جمہوری ریاست دنیا نے کبھی نہیں دیکھی۔ مغرب کی ترقی یافتہ جمہوریت نے جو اصول و اقدار، صدیوں کے ارتقائی سفر کے بعد بھی حاصل نہیں کیں، خلافت راشدہ نے ساتویں صدی عیسوی میں ہی دنیا کو دکھا دی تھیں۔ یہی

وجہ ہے کہ انسانی معاشروں کی اکثریت نے خلافت اسلامی کی سربراہی قبول کرتے ہوئے جابر سلطانوں کی غلامی کے طوق اتار پھینکے۔

وہ کون سے اصول تھے جو خلافت راشدہ کے ذریعے انسانی آبادیوں کی سماجی نجات کا ذریعہ بنے؟ آئندہ صفحات میں ہم انہی تاریخی حقائق کا تحقیقی مطالعہ کریں گے۔

فصل اوّل:

خلافت راشدہ، اصول ومبادی اور طرز حکومت

انعقاد خلافت

جناب رسول اللہ ﷺ جب دار فانی سے راہی بقا ہوئے تو اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے دو طبقے، خدمت اسلام کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ انصار مدینہ، جنہوں نے اسلامی ریاست کے قیام اور ارتقاء کے لئے ہر طرح کی خدمت بروئے کار لائی اور مہاجرین مکہ، جنہوں نے دین اسلام کی خاطر، رسول خدا ﷺ کی مدد اور خدمت، ہر طرح کے حالات میں اور ہر طرح کی قربانی دے کر کی تھی۔ یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ کس طبقے کو دوسرے پر کس قدر فوقیت حاصل تھی تاہم یہ بات واضح ہے کہ السابقون الاولون کی فہرست میں مہاجرین مکہ ہی آتے تھے، جنہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی ان میں سے تھے، چنانچہ وفات رسول ﷺ کے فوری بعد 'سقیفہ بنو ساعدہ' میں ایک عظیم الشان مجلس عام منعقد ہوئی جہاں اس امر کا فیصلہ ہونا تھا کہ رسول خدا ﷺ کا جانشین کون ہوگا؟

سقیفہ (چوپال یا چبوترا) قبیلہ انصار، خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کی ملکیت تھا جہاں انصار صحابہ حضرت سعد کو ہی اپنا خلیفہ بنانے کے لیے مشاورت کر رہے تھے۔ اس شرط پر اپنے حق سے دستبردار ہو گئے کہ نائب رسول مہاجرین میں سے ہوگا اور مشاورت وشوریٰ میں اولیت انصار کو حاصل ہوگی اور مسلمانوں کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ نائب رسول ﷺ حضرت عبداللہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ (۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے انعقاد کی بنیاد ہی متعلقہ افراد کی باضابطہ بحث وتمحیص اور مشاورت قرار پائی جس کے نتیجے میں مجلس عام نے، معاہدۂ خلافت باقاعدہ طور پر منظور کیا اور نائب رسول ﷺ کے طور پر خلیفۃ الرسول ﷺ حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت

کر کے اس کی توثیق کر دی۔ دورِ جدید میں مثالی جمہوریت یا جمہوری حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت معاملات حکومت میں عوام کی نمائندگی اور مشاورت کو سمجھا جاتا ہے، اس لحاظ سے خلافت راشدہ کا انعقاد مثالی جمہوریت کا آئینہ دار ہے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق ﷺ (۵۷۳ء۔۶۳۴) کا انتخاب ۱۲ اور ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ کی درمیانی رات مکمل ہوا اور ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ کو مسجد نبوی میں عامۃ المسلمین کے مجمع میں بیعت عام ہوئی اور اس کے بعد مسلمان اپنے نئے امام کے زیر قیادت جناب رسول اللہ ﷺ کے جسد خاکی کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ (۴)

خلافت راشدہ کی حکومت کا انعقاد انتخابی نوعیت کا تھا جبکہ خلفائے راشدین کے ہاں حکومت کا تصور، اس کی حیثیت، نوعیت اور اس کے فرائض کیا تھے؟ اس کا جواب خلیفہ اول کے ابتدائی خطاب سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

یایها الناس فانی قد ولیت علیکم، لست بخیرکم فان أحسنت فأعینونی و ان أسأت فقومونی، الصدق أمانة و الكذب خيانة والضعيف فيكم قوي عندي حتى أريح عليه حقه ان شاء الله، القوي منكم ضعيف عندي حتىٰ أخذ الحق منه ان شاء الله۔ لا يدع قوم الجهادفی سبيل الله الا ضربهم الله بالذل و لا تشيع الفاحشة في قوم قط الا عمهم الله بالبلاء و أطيعوني ما أطعت الله و رسوله فاذا عصيت الله و رسوله فلا طاعة لی علیکم..... (۵)

خلیفہ کا انتخاب

تاریخی حقائق کے مطابق عہد خلافت راشدہ میں خلفاء کا انتخاب مسلمانوں کی رضا مندی و مشاورت سے طے پاتا رہا اور امت مسلمہ کے اهل الرائے، اپنے میں سے بہترین شخص کو ہی خلیفۃ الرسول ﷺ کے طور پر منتخب کرتے رہے۔ یہ انتخاب موجودہ دور کے الیکشن سے کئی حوالوں سے مختلف تھا۔ اس انتخاب میں درج ذیل امور کو بنیادی حیثیت حاصل رہی:

ا۔ مشاورت برائے انتخاب، ب۔ امت کی رضامندی، ج۔ بیعت عمومی

اسی طرح جو عناصر، خلافت کے انعقاد میں خارج از تعامل رہے، وہ یہ تھے:

ا۔خلافت کی خواہش یا امیدواری، ب۔حق وراثت کی بنیاد پر مطالبہ خلافت،

ج۔مال یا تقرب کی بنیاد پر حصول خلافت کا تقاضا۔

نبی کریم ﷺ کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا اور بیعت عمومی مسجد نبوی میں ہوئی۔حضرت عمر فاروق ؓ کے انتخاب کے سلسلہ میں خلیفہ وقت حضرت ابوبکرؓ نے عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم، کے علاوہ دیگر مہاجرین وانصار سے بھی مشور کیا، پھر مسلمانوں کے اجتماع عام میں حضرت عمرؓ کا نام پیش کر کے منظوری ورضامندی حاصل کی جس کے بعد بیعت عام ہوئی۔حضرت عثمان غنی ؓ کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق ؓ نے ایک مشاورتی ادارہ تجویز کیا جسے آجکل کی سیاسی زبان میں Electoral College کہا جاسکتا ہے، جس میں حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنھم، شامل تھے۔یہ لوگ صلاحیت وکرذار کے لحاظ سے اعلیٰ وارفع درجہ پر فائز امت مسلمہ میں نمائندہ کردار Representative Character کے حامل تھے۔ان افراد کی آراء اور تین دن کے مسلسل مشورہ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب عمل میں آیا اور مدینہ میں بیعت عام کا انعقاد ہوا۔اسی طرح خلیفہ چہارم کے طور پر حضرت علیؓ بن ابو طالب کا انتخاب بھی مہاجرین و انصار کی نہ صرف رضامندی بلکہ اصرار پر ہوا اور انہوں نے اس وقت تک ذمہ داری نہیں سنبھالی جب تک مجمع عام میں بیعت عام منعقد نہیں ہوئی۔(۶)

شہادت عثمانؓ کے موقع پر کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو آپ نے اس رائے کو اہل شوریٰ اور اہل بدر کے فیصلہ سے مشروط کر دیا۔آپ نے فرمایا:

انما هو لأهل الشورىٰ و أهل بدر، فمن رضى به أهل الشورىٰ و أهل بدر فهو الخليفة.

اسی طرح آپ نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹے حضرت حسن کی نامزدگی سے احتراز کیا اور اس معاملے کو مسلمانوں کی رضامندی پر چھوڑ دیا۔(۷)

انتخاب کی بنیادی شرط

اسلامی ریاست میں خلیفہ کے انتخاب میں خاندانی قرابت، مال کی فراوانی یا موروثی

حق کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔خلفائے راشدین کے انتخاب میں جو چیز سب سے نمایاں طور پر پیش نظر رہی وہ متعلقہ فرد کی اہلیت،صلاحیت اور صالحیت ہے۔دور حاضر کا معتبر مؤرخ ٹی۔ ڈبلیو۔آرنلڈ (T.W. Arnold) لکھتا ہے:

There was certainly some form of election in the case of the first four Caliphs,...... in neither instance was there any question of hereditary succession, nor was the choice of either of these Caliphs influenced by considerations of relationship.(8)

سقیفہ بنو ساعدہ میں جو بحث وتمحیص ہوئی اس کی تفصیل پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام خلافت کے لئے تجویز ہونے میں بنیادی کردار اس بات کا تھا وہ امت مسلمہ کی امامت کے لئے اہل ترین فرد تھے۔اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کی وہ تقریر جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے شخصی و دینی شرف وعظمت کے موضوع پر تھی،آپ کے بطور خلیفہ منتخب ہونے کا جواز پیش کرتی ہے اور یہی آخر کار اس انتخاب کی بنیاد بھی بنی! آپ نے کہا کہ صدیق ؓ وہ شخص ہے جسے آنحضرت ﷺ نے نماز جیسی اہم چیز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا تھا،پس کیا جس شخص کو جناب نبی کریم ﷺ نے مقدم کیا تھا اس سے بھی پیش قدمی کی تم میں سے کسی کو خواہش ہے؟ (۹)

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے انتخاب میں آپ کی اہلیت کا،بنیاد انتخاب ہونا خلیفۂ اول کی اس تقریر سے ثابت ہے جو آپ نے مرض الموت میں صحابہ کے اجتماع میں کی۔اور وہ جواب جو آپؓ نے ایک صحابی کی عمر فاروقؓ کے مزاج کے بارے میں رائے کے سلسلے میں دیا:

لئن سألني الله لأقولن: استخلف عليهم خيرهم في نفسي. (۱۰)

'اگر مجھ سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا تو میں عرض کروں گا خدایا! میں نے تیرے بندوں میں سے اس کو منتخب کیا ہے جو ان میں سے سب سے اچھا ہے'۔

خلیفہ سوم اور چہارم کے انتخاب میں بھی اسی طرح سے امت نے اپنے میں سے بہترین افراد کو ترجیح دے کر،امامت کے مرتبے پر فائز کیا۔خلفائے راشدین کے انتخاب سے

استنباط کرتے ہوئے علمائے اسلام نے مسلمانوں کے خلیفہ وامام کے لئے درج ذیل شرائط انتخاب واہلیت مقرر کی ہیں:

۱۔اسلام،اخلاق وکردار، ۲۔آزاد،بالغ اور مرد ہونا،

۳۔علم اور اجتہادی بصیرت سیاسی تدبر،

۴۔قریشی ہونا (اختلاف ہے کہ یہ شرط صرف عرب کے مخصوص حالات کے لئے تھی)

علامہ ابن خلدون نے ،منصب امامت کی درج ذیل چار شرائط بیان کی ہیں:

۱۔علم (اجتہادی بصیرت)، ۲۔عدالت، ۳۔کفایت (ہمعصر خاندانوں پر فوقیت، صلاحیت، جرأت، فہم وشعور)، ۴۔سلامتی (محروم الاعضاء اور محروم الاختیار نہ ہو)۔ (۱۱)

حکومت۔۔۔۔ایک ذمہ داری

عہد خلافت راشدہ میں امامت وحکومت کو ایک ذمہ داری کے طور پر لیا گیا۔نہ اس کی خواہش رکھی گئی، نہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی گئی۔موجودہ دور کے سیاسی نظاموں میں کے برعکس، اس عہدے کے لئے اپنے آپ کو اہل تر ثابت کرنے کی کوشش اور اس سلسلہ میں ذرائع ابلاغ کا استعمال قطعاً نظر نہیں آتا بلکہ اسے بار امانت سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو دور رکھنے کی خواہش اور کوشش کی گئی تاہم جس شخص پر یہ ذمہ داری عائد ہوگئی پھر اس نے اپنی تمام صلاحیتوں، توانائیوں، وقت اور مال کو، اسی میں کھپا دیا۔اس طرز فکر وعمل کا بین ثبوت خلیفہ اول کی وہ پہلی تقریر ہے جو آپ نے خطبہ خلافت کے طور پر امت مسلمہ کے اجتماع میں کی۔اور آپکا انداز حکومت ہے جو خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس اور کردار کا عملی ثبوت ہے۔ (۱۲)

خلفائے راشدین کے حکومت کے بارے میں اس تصور کی وضاحت حضرت عمر فاروقؓ کے اس خطبہ سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے۔۔لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔(۱۳)

حضرت عثمان غنیؓ کے ایک خطبہ خلافت سے اسلامی حکومت کی اصولی بنیادیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں جس میں آپ نے فرمایا کہ تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا

ہوں۔ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کیے گئے تھے ان کی پیروی کروں گا۔دوسرے یہ کہ جن معاملات میں کوئی قاعدہ پہلے مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہل خیر کا طریقہ مقرر کروں گا۔تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے۔(۱۴)

شورائی حاکمیت

خلفائے راشدین کے اپنے انتخاب سے لے کر تمام اہم معاملات ریاست وحکومت تک،شوریٰ کے نظام کو تسلسل کے ساتھ قائم رکھا گیا۔ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں:

ان الامارة ما اؤتمر فيها و ان الملك ما غلب عليه بالسيف۔(۱۵)

'امارت یعنی خلافت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو'

خلیفہ اول نے اپنے پہلے خطبے میں یہ کہا تھا کہ:

فاذا رأيتموني قد اسقمت فاتبعوني و ان زغت فقوموني .(۱۶)

'جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے راستہ پر چل رہا ہوں تو میری اتباع کرو اور اگر میں راہ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کردو'

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش ہوتا جس میں اہل الرائے اور ارباب فقہ وبصیرت سے مشورہ کرنے کی ضرورت پڑتی تو مہاجرین وانصار کے منتخب لوگوں کو مدعو کرتے جن میں عمر،عثمان،علی،عبدالرحمٰن ابن عوف،معاذ بن جبل،ابی ابن کعب اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے لوگ شامل ہوتے،یہ وہ لوگ تھے جو حضرت ابوبکر وعمر کے زمانے میں مختلف مسائل میں مرجع انام سمجھے جاتے تھے،یہی طریقہ حضرت عمرؓ کا بھی رہا۔آپ نے فرمان مشہور ہے:

لا خلافة الا عن مشورة۔(۱۷)

عہد خلافت میں شوریٰ کے اہم اجلاسوں کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔چاروں خلفاء کے انتخاب میں مشاورت کی مختلف صورتوں کے علاوہ،شوریٰ برائے جیش اسامہ،شوریٰ برائے

منکرینِ زکوۃ، حضرت عمر فاروقؓ کی شوریٰ برائے معاہدہ بیت المقدس (۱۵ھ) وغیرہا، اس سلسلہ کی چند مثالیں ہیں۔(۱۸)

خلفائے راشدین کے پورے دور میں مجلس شوریٰ نے ہر اہم معاملے میں فیصلے کیے۔ یہ شورائیت کسی خاص علامتی ایوان تک محدود نہیں رہتی تھی بلکہ حقیقی آزادی رائے سے مزین، عوام کا یہ اختیار، عمل کے میدان میں ثابت ہوتا رہا۔ شوریٰ کا ادارہ، ایک متحدہ و متفقہ اجتماعیت کا ایسا ادارہ رہا کہ جہاں ہر فرد بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنے ضمیر کے مطابق رائے کا اظہار کرتا اور حکومت کی کارکردگی پر بے لاگ تبصرہ کرنے کا مجاز ہوتا، اس کی رائے، عصر جدید کی سیاسی پارٹی بازی کے برعکس، کسی سیاسی مفاد اور طبقاتی وابستگی کی آلودگی سے بالاتر ہوتی جو بلا کم و کاست ایوان میں پیش ہو جاتی۔

دور خلافت میں، شخصی آزادی رائے کا احترام کس درجے کا تھا، اس بات کا اندازہ حضرت عمر فاروقؓ کے اس خطبہ سے ہوتا ہے جو آپ نے ایک مجلس مشاورت کے آغاز میں دیا۔ آپ نے فرمایا کہ: میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لئے تکلیف دی ہے وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے، اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔(۱۹)

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں مجلس شوریٰ کے علاوہ ایک مجلس عام تھی جس کا اجلاس، وقتاً فوقتاً طلب کیا جا سکتا تھا اور اہم امور پر مشاورت ہوتی۔ اس مجلس میں مہاجرین و انصار کے علاوہ تمام سرداران قبائل شریک ہوتے تھے۔ مجلس شوریٰ کے انعقاد کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا کہ منادی کرنے والا خلیفہ کیطرف سے "الصلاۃ جامعۃ" کے الفاظ سے شوریٰ کے اجلاس کا اعلان کرتا۔ لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تو حضرت عمرؓ، دو رکعت نماز پڑھ کر بحث طلب مسئلہ سے متعلق لوگوں کو بتاتے اور مشاورت ہوتی۔ حضرت عثمان غنی ﷜ نے عمال حکومت کی ایک مجلس شوریٰ قائم کی تھی۔ علاوہ ازیں آپ تحریری آراء بھی طلب کرتے۔ کوفہ کے فتنہ میں آپ نے اسی طریقہ پر عمل کیا۔ ۳۴ھ میں ملکی اصلاحات کے لئے آپ نے عمال کی مجلس منعقد کی۔(۲۰)

بیت المال۔۔۔۔۔۔ایک امانت

خلفائے راشدین نے بیت المال کو خدا اور خلق خدا کی امانت سمجھ کر استعمال کیا۔ ذاتی اغراض کے لئے حکومتی سرمایہ کا استعمال حرام سمجھا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد بھی کسب روزگار کے لئے اپنا کاروبار تجارت جاری رکھا، حتیٰ کہ حکومت کی طرف سے آپ کے لئے ایک عام آدمی کی آمدنی کے برابر وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔۔۔ مگر وفات کے وقت آپ ؓ نے وصیت کر دی کہ ترکے میں سے سب سے پہلے وہ رقم نکال کر سرکاری خزانے میں جمع کروا دی جائے جو انہیں وظیفہ کے طور پر دی جاتی رہی۔ (۲۱)

حضرت علی ؓ نے اپنی تنخواہ کا معیار وہی رکھا جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر ؓ کا تھا۔ آپ بازار میں اس شخص سے کوئی چیز نہ خریدتے جو آپ کو جانتا ہوتا کہ وہ کہیں خلیفہ کو دوسروں سے کم قیمت نہ لگائے۔ (۲۲)

جہاں تک سرکاری بیت المال کے نظام کا تعلق ہے تو حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں مجلس شوریٰ کے مشورہ سے مدینہ منورہ میں، بہت بڑا خزانہ قائم کیا گیا۔ دارالخلافہ کے علاوہ تمام اضلاع اور صوبہ جات میں اس کی شاخیں پھیلائی گئی تھیں اور ہر جگہ اس محکمہ کا علیحدہ انچارج آفیسر مقرر تھا۔ تمام ذیلی شاخوں کی آمدن علاقائی مصارف پر استعمال ہوتی جو رقم بچ جاتی وہ سال کے اختتام پر مرکزی بیت المال میں جمع کروا دی جاتی۔

مرکزی حکومت

ریاست مدینہ کا نظام بنیادی طور پر مرکزی حکومت کا نقشہ پیش کرتا ہے جبکہ انتظامی تقسیم میں صوبائی نظام پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھا۔ حکومت کا سربراہ خلیفہ یا امیر المؤمنین کہلاتا جو بیک وقت سیاسی، معاشی اور دفاعی امور و اختیارات کا منبع تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے مملکت کو متعدد صوبوں اور اضلاع میں تقسیم کر دیا تھا۔ خاص خاص صوبے یہ تھے:

مدینہ، مکہ، طائف، صنعاء، نجران، بحرین دومۃ الجندل، عراق، اردن، دمشق، فلسطین

مرکز خلافت مدینہ منورہ تھا جہاں مرکزی شعبہ جات قضا، شوریٰ، افتاء، کتابت اور

دفاع قائم تھے۔ مرکز سے عمال حکومت یا گورنر نامزد ہوتے اور پھر انہیں ایک سرکاری فرمان دیا جاتا جو ضروری ہدایات پر مشتمل ہوتا تھا۔

خلیفہ اول نے عمرو بن العاص ؓ کو بطور گورنر تقرری پر فرمایا تھا:

انك في سبيل الله يسعك فيه الأذهان و التفريط و الغفلة عما فيه قوام دينكم و عصمة أمركم فلاتن و لا تفتر۔(۲۳)

'تم خدا کی ایک ایسی راہ پر ہو جس میں افراط وتفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں ،جس میں دین کا استحکام اور خلافت کی حفاظت مضمر ہے،اس لئے سستی اور غفلت کو راہ نہ دینا۔'

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ؓ نے ریاست اسلامی میں وسعت کے پیش نظر صوبوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔صوبائی سطح پر معاملات حکومت کو چلانے کے لئے مرکز کے تحت والی (گورنر)کاتب (سیکرٹری)صاحب الخراج (ٹیکس کلیکٹر)صاحب احداث (پولیس آفیسر)صاحب بیت المال (افسر خزانہ)قاضی (جج) جیسے عہدیداروں کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے عمل میں لایا جاتا۔

ٹیکس کی نوعیت اور شرح کا تعین مرکزی حکومت کرتی تھی۔زرعی اصلاحات اور مردم شماری بھی مرکز کے تحت کروائی گئی۔حضرت عثمان غنی ؓ اور حضرت علی ؓ کے دور خلافت میں اسی انتظامی تقسیم کے ساتھ مرکزی نظم مملکت چلتا رہا جبکہ صوبوں کی تعداد وسعت پذیر اسلامی ریاست میں بیس تک پہنچ گئی۔(۲۴)

حکام کی نگرانی واحتساب

خلافت راشدہ کی مرکزی حکومت میں حکام وعمال کے انتخاب میں حد درجہ احتیاط برتی جاتی۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی مسلسل نگرانی وخبر گیری کا اہتمام مستقل طور پر جاری رہتا۔خلیفہ اول، ذاتی معاملات میں رفق و ملاطفت کا پیکر تھے مگر اجتماعی انتظامی،معاملات میں کسی نرمی و لاپرواہی کے روادار نہ تھے۔آپ نے حضرت عمرو بن العاص کی بطور گورنر تقرری پر انہیں ہدایت کی کہ اپنے آپ کو درست رکھو،تمہاری رعیت بھی درست رہے گی۔(۲۵)

حضرت عمر فاروق ﷛ اپنے اوپر نکتہ چینی واحتساب کو عوام کی آزادی کا حصہ سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمر ﷛ سے کہا: اتق اللہ یا عمر! (اے عمر! خدا سے ڈرو!) حاضرین میں سے ایک شخص نے اسے روکنا چاہا تو حضرت عمر نے اس سے فرمایا:

نہیں اسے کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں گے تو یہ بے مصرف ہوں گے
اور ہم نہ مانیں گے تو ہم بے مصرف ہیں۔(۲۶)

آپ اپنے ہر عامل سے یہ عہد لیتے تھے کہ وہ ترکی گھوڑا استعمال نہ کرے گا، باریک کپڑا نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازہ پر دربان نہ رکھے گا، اور ضرورت مندوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے گا۔

خلیفہ دوم کا یہ بھی مستقل طریقہ رہا کہ حج کے موقع پر اجتماع عام میں حکام کے خلاف شکایات سنتے اور ان کا ازالہ فرماتے۔ عمال اور افسران کے احتساب میں کبھی تامل سے کام نہ لیا۔ حضرت خالد بن ولید جیسے سپہ سالار کو ایک غیر ضروری انعام دینے کی پاداش میں اپنے عہدے سے معزول کر دیا۔ اسی طرح آپ کی احتسابی کارروائیوں سے ابوموسیٰ اشعری، سعد بن ابی وقاص، ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر حکام بھی نہ بچ سکے۔(۲۷)

حضرت عثمان غنی ﷛ جیسی حلیم الطبع شخصیت خلافت کی ذمہ داری کے دوران میں اس معاملے میں کسی مصلحت کا شکار نہ ہوئی اور والی بصرہ کو شان وشوکت کے غیر ضروری اظہار ونمائش پر معزول کر دیا۔(۲۸)

حضرت علی ﷛ نے حکام کے معاملات پر کڑی نگاہ رکھی جب بھی کسی کو عامل مقرر کرتے تو اسے نہایت مفید اور بیش قیمت نصائح اور ہدایات سے نوازتے۔ آپ کے روزمرہ گشت سے کوئی اجنبی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اتنی بڑی اسلامی ریاست کا خلیفہ ہے جو اس کے سامنے اس حالت میں پھر رہا ہے کہ نہ شاہی لباس ہے اور نہ ہٹو بچو کی صدائیں! آپ نے خلافت سنبھالتے ہی صوبوں کے گورنر عوام کی شکایات کے ازالہ کی خاطر تبدیل کر دیئے۔(۲۹)

قانون کی بالادستی

خلافت راشدہ میں ریاست کے باشندے دو طرح کے تھے: مسلمان اور غیر مسلم،

خلفائے راشدین نے اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو قانون سے بالاتر حیثیت نہیں دی بلکہ ایک عام شہری کی سطح پر رہ کر، رئیس مملکت کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اگر چہ قاضی کا تقرر خلیفہ وقت کے حکم سے ہوتا تھا مگر قضاۃ اپنے فیصلے صادر کرنے میں اس قدر آزاد ہوتے تھے کہ خود امیر المؤمنین کے خلاف مقدمات کی سماعت کرنے اور فیصلہ دینے میں ذرہ برابر نہ چوکتے۔

خلیفہ دوم ایک معاملے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے ہاں فیصلے کے لئے حاضر ہوئے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد، مجلس کے اختتام پر فرمایا کہ زید، قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ عمر اور ایک عام مسلمان، ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔

حضرت علیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی گمشدہ زرہ، ایک عیسائی کو بازار میں بیچتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کی بنیاد پر اس سے زرہ کے حصول کے لئے، سرکاری قوت اور اپنی حیثیت کا استعمال نہیں کیا بلکہ عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ قاضی نے بلا رورعایت، خلیفہ کیخلاف فیصلہ دے دیا کیونکہ آپ اپنے استغاثہ کے حق میں کوئی گواہ پیش نہ کر سکے تھے۔

ایک مشہور روایت ابن خلکان نقل کرتے ہیں کہ ایک مقدمہ میں حضرت علی ایک غیر مسلم شہری کے ساتھ بطور فریق، قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی شریح، امیر المؤمنین کے آنے پر احتراماً کھڑے ہو گئے تو حضرت علیؓ نے کہا کہ " آپ نے پہلی بے انصافی تو یہی کی ہے!"۔ (۳۰)

اصول سیاست کے لحاظ سے خلافت کے امتیازی اوصاف

حاکمیت اعلیٰ

خلافت راشدہ نہ تو کسی فرد واحد کی مطلق العنانیت تھی اور نہ ہی کسی گروہ یا جماعت کی اجارہ داری، بلکہ عوام الناس کے 'رضا کارانہ عہد اطاعت' یعنی بیعت کی بنیاد پر قائم، جناب نبی کریم ﷺ کی وہ جانشینی تھی جس میں حاکمیت اعلیٰ یا اقتدار اعلیٰ، مالک الملک خدائے واحد کو حاصل تھا۔ لہذا خلافت، عوام الناس کی مرضی یعنی Gereral Will کی بجائے مالک حقیقی کی رضا یعنی Divine Will کے عملی نفاذ کی سیاسی حکمت عملی کا نام تھا۔

قدیم ریاستی نظاموں سے متعلق تاریخی شواہد کے وہ حوالے جو ہم نے گذشتہ صفحات

میں دیئے ہیں، کے مطابق دنیا کی سیاسی تاریخ ایک ہی کشمکش کی روداد نظر آتی ہے، وہ یہ کہ حاکیت اعلیٰ کے مالک عموماً بادشاہ کی شکل میں فرد واحد بنے رہتے ہیں اور ان کے جبر کے ردعمل میں عوام الناس اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہتے ہیں، یہی سیاسی چکر دائمی طور پر چلتا رہا ہے۔ فرد واحد سے اقتدار اعلیٰ Ultimate/ Absolute Authority لے کر عوام کی اکثریت کے ہاتھوں میں دیدیا جائے جسے، وہ خود یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے سے روبہ عمل لائیں تو یہ نظام 'جمہوریت' کا روپ دھار لیتا ہے۔

مذکورہ بالا کشمکش کی کہانی جمہوریت کے ارتقاء کی کہانی ہے جو یونان وروم کی تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ قدیم یونانی جمہوریتوں کا نظام شہری ریاست کے عوام کے پاس ہوتا تھا اور وہ اپنی مرضی کے تحت اس اختیار کو استعمال کرتے تھے۔ ارسطو نے اقتدار اعلیٰ کو عوام کے غالب حصے کا حق قرار دیا تھا۔ (۳۱)

اس عوامی حاکیت (Rule of People) کے مقابلے میں خلافت راشدہ میں جو نظام نظر آتا ہے وہ عوام کے مشورے اور رائے کے ساتھ ایسے حاکم کا انتخاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کو ریاست میں اس طرح نافذ کرتا ہے، جس طرح اس نے نبی آخر الزماں ﷺ کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔ اگر یہ حاکم ایسا نہ کرے تو اسے اسلامی تعلیمات کی اصطلاح میں بادشاہ یا باغی تو کہا جا سکتا ہے خلیفہ نہیں۔ اس اصول کے مطابق دور خلافت راشدہ میں نظام حکومت وسیاست سے ثابت کیا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کی مالک، خالق کائنات کی ہستی ہے۔ ریاستی حاکیت، کسی انسان کے پاس اصل مالک کی طرف سے امانت کے طور پر سپرد ہوتی ہے اور وہ اس اختیار کے سلسلہ میں اپنے رب کے سامنے ہی جوابدہ ہے۔

اس حقیقت کی مکمل وضاحت، خلفائے راشدین کیطرف سے، انتخاب خلافت کے موقع پر دیے گئے، خطبات میں موجود ہے اور ان خلفاء کے طرز حکومت، اسی اصول کا منہ بولتا عملی ثبوت ہیں۔ مثال کے طور پر خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے یہ الفاظ کہ:

اطیعوني ما اطعت اللّٰہ و رسوله فاذا عصیت اللّٰہ و رسوله
فلا طاعة لي علیکم۔

اسی طرح خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اہل مصر کے نام (قیس بن سعد کی تقرری بطور

گورنر کے موقع پر)۔ سرکاری فرمان، اور حضرت عمرؓ کا قاضی شریح سے یہ فرمانا کہ:

اقض بما استبان لك من كتاب الله۔(۳۲)

مذہب کا کردار

قدیم یونانی جمہوریتوں میں مذہب کا کسی نظام سیاسی کے طور پر کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ اگرچہ سیاسی نظریات میں فلاسفہ اور مفکرین کے خیالات کو بڑا دخل تھا اور ان تصورات میں قدیم انبیاء کی تعلیمات کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یونان کے بابائے فلسفہ سقراط کا موت کے بارے میں تصور، اس بات کی واضح دلیل ہے۔(۳۳)

تاہم وہ ریاستی نظام جو بعد میں جمہوریت کے روپ میں سامنے آیا، حکومتی سطح پر مذہب کے کردار کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ البتہ روم میں، دور وسطیٰ میں مذہب نے اقتدار کے زینے عبور کئے اور قدیم نظریہ بادشاہت الوہی Divine Kingship پھر سے حاوی ہوگیا۔ بادشاہوں نے مذہب کا استعمال، اپنے اقتدار کو مؤثر اور وسیع کرنے کے لئے کیا۔

عیسائیت کا مذہب اور انکی مقدس کتاب انجیل میں، ریاست کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی شعبہ ہائے زندگی کے لئے ٹھوس نظام موجود نہیں تھا۔ لہذا بادشاہت کے ساتھ اس مذہب کے گٹھ جوڑ نے، لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہونے کے علاوہ کوئی مثبت اور تعمیری کام نہ کیا۔ لہذا مذہب اور سیاست یعنی کلیسا اور شہنشاہت کے تصادم کے نتیجہ میں سلطنت روما پارہ پارہ ہوگئی۔

مدینہ کی اسلامی ریاست جو خلفائے راشدین کے دور میں دنیا کے تین براعظموں میں اپنے اثرات پھیلا چکی تھی، مکمل طور پر مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے اور نشونما پانے والی ریاست تھی۔ اس ریاست کی بنیاد ہی مذہب اسلام کو مکمل کرنے والے خاتم النبیین ﷺ نے رکھی تھی۔ لہذا یہاں ریاست و مذہب ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ دین اسلام محض پوجا پاٹ کے چند طریقوں کا مجموعہ نہیں تھا بلکہ اس نے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے اصول وضوابط مہیا کئے تھے۔ لھٰذا، دین وسیاست میں تفریق کی بجائے، ریاست وسیاست اور تہذیب وتمدن کی بنیادیں، جناب رسول خدا ﷺ نے مذہب اسلام کے اصولوں پر اٹھائی تھیں۔ خلافت اسلامیہ کے دارالخلافہ میں، خلیفہ وقت بیک وقت، بطور سربراہِ مملکت، بطور چیف جسٹس، بطور سپہ سالار اعظم اور بطور امام الصلاۃ کام کرتا تھا۔

مدینہ کی اسلامی ریاست اس لحاظ سے دنیا کی منفرد ریاست ہے کہ وہ رسول خداﷺ کے ہاتھوں قائم ہوئی۔ اس ریاست کے قیام میں، رسول خداﷺ کی دعائیں، اور جد و جہد، خدائے یکتا کی رضاونصرت اور عوام کی رغبت کا بنیادی کردار تھا۔ گویا یہ ایک انسانی معاشرے کا اپنے رب کے ساتھ، رسول خداﷺ کے ذریعے قائم ہونے والا، رضا کارانہ سماجی معاہدہ تھا جو پاکیزہ مقاصد کی بنیاد پر استوار ہوا اور پاکیزہ نتائج پر منتج ہوا۔

عوامی نمائندگی

انسانی معاشروں کے اجتماعی معاملات کو چلانے کیلئے ہمیشہ سے حکومتی مشینری میں عوامی نمائندگی یا عوام کی شرکت کا کوئی نہ کوئی اصول وطریقہ کارفرما رہا ہے۔ قدیم قبائلی جمہوریت میں قبائلی سردار سیاسی حاکمیت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ عوام الناس کی نمائندگی ایسے افراد کو ملتی رہی جو کسی بھی حوالے سے معاشرے کے نمایاں افراد ہوتے۔ بدلتے تقاضوں اور ضروریات کے تحت اس نمائندگی کے اصولوں اور طریقوں میں فرق آتا رہا ہے۔ تاہم جب بھی جبر کے ذریعے کسی فرد واحد کی حکومت قائم ہوئی تو لوگوں نے جلد یا بدیر اس سے آزادی کی جدوجہد شروع کر دی اور یوں جمہوری رویوں کا سفر جاری رہا۔

قدیم یونانی جمہوریتوں میں شہری ریاست کے عوام براہ راست سیاسی وسماجی فیصلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ظاہر ہے ایسا کم آبادی والی چھوٹی ریاستوں میں ممکن ہوسکتا تھا۔ خلافت راشدہ میں بیعت عام اور مجلس شوریٰ کے تحت لوگ ریاستی امور میں شامل رہتے تھے۔ (۳۴)

خلافت اور جمہوریت کے طرز ہائے حکومت میں، عوامی نمائندگی کے اصول، عملاً دو پہلوؤں سے، بالکل مختلف ہیں:

۱۔ جمہوری ریاست میں عوام کی اکثریت کی رائے اور رویے سے، حلال وحرام، جائز و ناجائز اور حق و باطل کے بنیادی فیصلوں تک کو تبدیل کیا جا سکتا ہے جبکہ خلافت میں عوام الناس کی سو فیصد اکثریت بھی ایسے بنیادی فیصلے کرنے کی مجاز نہیں ہے جو شریعت کے خلاف ہوں اور نہ ہی یہ اختیار عوام کے نمائندوں یا حکمرانوں کو کسی بھی قیمت پر حاصل ہوسکتا ہے۔ تاہم اجتماعی معاملات میں عوام کی شرکت کا پہلو، نظام خلافت میں اس قدر اہم ہے کہ خود خلافت کا انعقاد ہی اس وقت

تک ممکن نہیں جب تک کہ لوگ بیعت عام کے ذریعے اس کی تائید نہ کردیں۔

اسلامی تعلیمات میں ایسی حکومت، ملوکیت یا Autocracy ہے جو بیعت کے بغیر قائم ہوئی ہو۔ خلافت منعقد Establish ہی بیعت کے ذریعے ہوتی ہے اور مشاورت وشوریٰ کی بنیاد پر چلتی اور قائم رہتی ہے۔

ب۔ 'عوام' سے مراد قدیم شہری ریاستوں میں مرد شہریوں پر مشتمل وہ 'خواص' تھے جنہیں 'شہری' کہا جا سکتا تھا۔ معاشرے میں آزاد آبادی کا نصف یعنی طبقۂ خواتین، حقوق شہریت سے محروم ہوتا تھا جبکہ 'غلام' کسی گنتی میں نہیں آتے تھے حالاں کہ ان کی تعداد ہر ریاست میں 'شہریوں' سے کئی گنا زیادہ ہوتی تھی۔ اسلامی خلافت میں ایسی طبقاتی تقسیم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ عوام یا جمہور سے مراد مسلمانوں کی اجتماعیت تھی جس میں کسی کو اس کی معاشی حالت اور سماجی مقام کی بنیاد پر کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔ یہاں شہری حقوق کے لحاظ سے تمام برابر تھے۔

مساوات انسانی

عہد خلافت راشدہ سے پہلے کی تمام انسانی تہذیبیں خواہ مصر، ایران ، روم اور ہندوستان کی وسیع شہنشاہتیں ہوں یا یونان کی چھوٹی چھوٹی 'جمہوریتیں'۔۔ مساوات انسانی کے اصول سے ہمیشہ نا آشنا رہیں۔ اسلامی خلافت میں ان ریاستوں کی طرح حاکم ومحکوم، فاتح و مفتوح، امیر وغریب، سفید وسیاہ، آزاد وغلام اور کثیر وقلیل کی بنیاد پر قائم کوئی طبقاتی معاشرہ نظر نہیں آتا۔ یہاں فارس سے آنے والا سلمان شوریٰ کا اہم رکن بن سکتا ہے اور حبشہ سے آنے والا غلام 'سیدنا بلال' (ہمارا سردار بلال) کہلواتا ہے۔

خلافت راشدہ میں خلیفہ وقت کے لئے ہمعصر ریاستوں کے مقابلے میں، کوئی علیحدہ قانون نہیں تھا بلکہ وہ عوام الناس کی طرح عدالت میں بوقت ضرورت سائل اور مسئول کے طور پر حاضر ہوتا تھا۔ اس سے بڑھ کر قانونی مساوات کیا ہوگی کہ خلیفۂ چہارم، قاضی شریح کی عدالت میں ایک ذمی کے ساتھ ایک فریق کے طور پر حاضر ہوتے ہیں اور قاضی کے تکریم خلیفہ میں اٹھ کھڑے ہونے کو 'نا انصافی' قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر معاشرتی مساوات کا مظاہرہ کس طرح ہوگا کہ خلیفۂ دوم جب بیت المقدس کے فتح کے موقع پر معاہدہ کے لئے یروشلم گئے تو سواری پر آدھا

سفر آپ نے اور آدھا آپ کے غلام نے کیا۔(۳۵)

اس سلسلہ میں اسلامی طرز حکومت اور جمہوری نظام سیاست کے فرق کو شاہد حسین رزاقی نے یوں واضح کیا ہے کہ:

یونان کی شہری مملکتوں میں جمہوریت کو انتہائی فروغ حاصل ہوا لیکن ایتھنز جیسے ترقی یافتہ جمہوریہ میں بھی عورتیں حقوق سے محروم تھیں اور آبادی کی عظیم اکثریت ایسے غلاموں پر مشتمل تھی جو نہ صرف سیاسی بلکہ انسانی حقوق تک سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ یہی حال دوسری ریاستوں کا تھا چنانچہ یونانی جمہوریت کا تاریک پہلو معاشرتی مساوات کا فقدان تھا۔ یونانی اور رومن جمہوریت کی ان خامیوں کو اسلام کے جمہوری حقوق اور معاشرتی مساوات کے تصور نے دور کیا اور اپنے ان اصولوں کو عملی شکل میں نافذ کیا جو موجودہ جمہوریت کے بنیادی اصول تصور کئے جاتے ہیں۔(۳۶)

بنیادی حقوق

خلافت اسلامی نے اپنی رعایا کو جن بنیادی حقوق سے بہرہ مند کیا، ان کے عنوانات درج ذیل بنتے ہیں:

جان، مال اور عزت و آبرو کا تحفظ۔ سماجی، معاشی اور قانونی مساوات۔ مذہب، سکونت اور اظہار خیال کی آزادی۔ عدل، تعلیم اور وسائل زندگی کی فراہمی۔ قانون وراثت، عورت کے معاشی حقوق اور سماجی مرتبے کا تحفظ اور انسداد غلامی۔۔۔ انفرادی سطح پر افراد معاشرہ کو حریت و مساوات کا تحفہ اور اجتماعی سطح پر سیاسی و معاشی ظلم و استیصال سے نجات۔۔۔

یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جب انسانی سماج، ابھی اپنے بنیادی حقوق کا شعور ہی حاصل نہ کر پایا تھا اور حقوق کی کوئی واضح فہرست بھی مرتب نہیں ہوئی تھی۔

خلیفہ اول نے اپنی پہلی تقریر میں ہی حقوق کی ادائیگی کا عہد اس انداز میں کیا کہ:

الضعیف منکم قوي عندی حتیٰ أزیح علیه حقه ان شاء اللّٰه، و القوي منکم ضعیف عندي حتیٰ أخذ الحق منه ان شاء اللّٰه۔ (۳۷)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عمال کو ہدایت کرتے ہیں کہ:

تم ان (اپنی رعایا) کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک نہ بن جاؤ۔ ان کی ماؤں

نے ان کو آزاد جنا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کا ہر فطری حق چھین لے۔(۳۸)

خلفائے راشدین کے طرز حکمرانی کے اس پہلو کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں کہ:

یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطہ سے نہ کرتے تھے بلکہ براہ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز باجماعت میں، ہر ہفتے جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں ان کو قوم سے اور قوم کو ان سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب و دربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے اور ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انہیں ٹوکنے، ان پر تنقید کرنے اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی اور اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت نہ دیتے تھے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔(۳۹)

مسلم رعایا تو ایک طرف، غیر مسلم شہریوں کے ساتھ رواداری اور انسان دوستی کا اظہار خلافت راشدہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے:

۱۔ خلیفہ اول کی طرف سے اہل حیرہ کے ساتھ معاہدہ میں یہ باتیں شامل تھیں کہ:

لا يهدم لهم بيعة و لا كنيسة و لا قصر من قصورهم التي كانوا يتعضون اذا أنزل بهم عدو لهم و لا يمنعون من ضرب النواقيس و لا من اخراج الصبيان في عيدهم.

۲۔ اسی طرح جو ذمی بوڑھے، اپاہج اور مفلس ہو جاتے نہ صرف ان کا جزیہ معاف ہو جاتا بلکہ اسلامی ریاست کا بیت المال ایسے لوگوں کی کفالت کا ذمہ دار ہو جاتا۔

۳۔ خلیفہ ثانی کے دور خلافت میں جنگی حکمت عملی کے تحت حمص کا مفتوحہ علاقہ مسلمانوں نے خالی کر دیا اور پورے علاقے میں، غیر مسلموں سے لیا ہوا جزیہ واپس کر دیا گیا۔ اس بنیاد پر کہ جزیہ انکے تحفظ کے بدلے میں وصول کیا گیا تھا۔ اب چوں کہ مسلمان اس مفتوحہ علاقے کو چھوڑ رہے ہیں، یہ علاقہ مسلمانوں کی عملداری میں نہیں ہوگا اور وہ عوام کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ لھذا وہ جزیہ اپنے پاس رکھنے کے حقدار نہیں۔ انصاف اور حسن سلوک کی اس روایت پر، عیسائی اور یہودی نہ صرف حیران ہوئے بلکہ مسلمانوں کی دوبارہ فتح اور آمد کیلیے دعائیں کرتے

رہے۔(۴۰)

نوعیت ریاست

خلافت راشدہ سے پہلے قائم شدہ ریاستیں عموماً ایک خاص قومی عصبیت پر قائم ریاستیں تھیں جبکہ خلافت اسلامی، وطن، رنگ، نسل، قوم اور قبیلہ کی عصبیتوں سے پاک ایک ایسی نظریاتی ریاست تھی جو دیگر مذاہب اور نظریہ ہائے زندگی کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر چلتی رہی۔ خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں حق سچ کے قبول ورد کا انحصار بھی قبائلی عصبیت پر ہو اور نبی کو ماننا اور نہ ماننا بھی قبیلے کی بنیاد پر ہو۔۔۔ خلفائے راشدین نے بے لاگ اور غیر متعصبانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل بلکہ غیر عرب نومسلموں کے ساتھ وہ منصفانہ برتاؤ رکھا جو آج تک بے مثل ہے۔

خود اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کے ساتھ خصوصی سلوک سے نہ صرف اجتناب برتا گیا بلکہ سوائے حضرت عثمان غنی ؓ کے (جنہوں نے معیار اور کردار کو سامنے رکھ کر اپنے قبیلے پر زیادہ اعتماد کا اظہار کیا) ہر ایک خلیفہ نے اپنے خاندان اور قبیلے کو حکومتی عہدوں اور مراعات سے قطعاً دور رکھا۔ اس سلسلہ میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی وہ ہدایت قابل توجہ ہے جو آپ نے آخری وقت میں حضرت علیؓ، حضرت عثمان ؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ (تینوں ممکنہ خلفاء) کو بلا کر دی تھی کہ:

اگر میرے بعد تم خلیفہ بنو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا (۴۱)

خلافت ایک ایسی ریاست تھی جس میں عوام کی خدمت اور حقوق کی ادائیگی کی خاطر خلیفہ، اپنے اختیارات امانت تصور کر کے کا استعمال کرتا، اس احساس ذمہ داری کے ساتھ کہ اسے خالق حقیقی کے سامنے پیش ہو کر اس کا جواب دہ ہونا ہے۔ خلافت راشدہ کی معاصر ریاستیں خواہ وہ یونان وروما کی قومی ریاستیں ہوں یا چین وایران کی شہنشاہتیں۔۔۔ ایسے کسی بھی رویے اور اہتمام سے دور تھیں۔ وہ یا تو قومی، نسلی اور وطنی عصبیت پر قائم تھیں یا مطلق العنان بادشاہتوں کے تحت مخصوص افراد اور خاندانوں کی ملکیت بنی ہوئی تھیں۔

قانون کی عملداری اور عدل وانصاف کی فراہمی بھی کسی طرح کی گروہی اور مذہبی

عصبیت سے بالاتر تھی۔ اس سلسلہ میں خلیفہ چہارم علی مرتضی کی مسروقہ زرہ والا واقعہ قابل ذکر ہے جس میں آپ نے ایک ذمی (غیر مسلم شہری) کو وہی زرہ بازار میں بیچتے دیکھ لیا اور عدالت سے رجوع کیا جہاں وہ اپنے حق میں گواہی پیش نہ کر سکنے پر اپنی زرہ، مذکورہ عیسائی سے واپس نہ لے سکے۔۔۔۔۔ نہ تو خود خلیفہ وقت نے کسی تعصب میں مبتلا ہو کر اپنے اختیارات کا استعمال کیا اور نہ ہی قاضی نے کسی ایسے جذبے کی بناء پر غیر مسلم کے خلاف فیصلہ دیا۔ اسی مذہبی رواداری کا ثبوت اس تاریخی معاہدے سے بھی ملتا ہے جو حضرت عمر فاروق ؓ کے عہد میں فتح بیت المقدس جنوری ۶۳۷ء) کے موقع پر مسلمانوں نے دیگر اقوام اور مذاہب کے ساتھ کیا۔ (۴۲)

آئین ریاست اور ریاستی منشور

خلافت راشدہ اس ریاست الٰہیہ کے تسلسل کا نام تھا جس کا آغاز نبی آخر الزمان ﷺ نے قرآنی ہدایات کے تحت کیا تھا۔ دنیا کو پہلے تحریری دستور ریاست 'میثاق مدینہ' تیار کر کے آپ ﷺ نے اللہ کی حاکمیت قائم کی۔ لہذا اس ریاست کا دستور و آئین آخری الہامی کتاب قرآن مجید پر مبنی تھا۔

اس دستور میں نہ تو یونانی جمہوریتوں کی طرح عوامی خواہشات کا گورکھ دھندا اور اکثریت کا جبر Tyranny of Majority تھا اور نہ ہی ایران، روم اور چین و ہندوستان کی طرح آئین و دستور سے ماوراء بادشاہ کی بے لگام مرضی کا قانون ۔۔۔ یہاں بادشاہ کے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے اور نہ ہی عوام الناس کی خود غرضانہ خواہشات قانون پر حاوی تھیں۔ یہ خالق کے عطا کردہ راہنما اصولوں کی، رسول خدا کی طرف سے کی گئی عملی تشریح کے مطابق، خدا ترس لوگوں کا، عوام کی اجتماعی فلاح پر مبنی، ایک ایسا منشور Manifesto تھا، جس کی ہر شق خوف خدا اور خدمت خلق کے اصولوں سے مربوط تھی۔

خلافت اسلامی میں اقتدار کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے دیئے آئین میں حلال و حرام، حق و باطل اور حقوق و فرائض کا فیصلہ موجود ہے۔ اس ضابطے کی پیروی ریاست میں حاکم و محکوم اور خلیفہ و رعایا سب کے لئے یکساں طور پر لازمی ہے لہذا اس ریاست میں دستوری جمہوریت کے تحت ایک 'امین' حکومت قائم ہوتی ہے جو دستور الٰہی نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے

اور خدا کے سامنے جوابدہ بھی۔۔۔۔وہ خلق خدا کے حقوق کی پاسبانی کے لئے رب اعلیٰ کے اقتدار کو نافذ کرنے کی مکلف ہے۔لہذا ایسی حکومت اپنے بنیادی دستور کے لحاظ سے خود سر اور مطلق العنان نہیں ہو سکتی۔یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اول اپنے عوام سے یہ کہتے ہیں کہ:

فان احسنت فاعينوني و ان ساء ت فقوموني ... و اطيعوني ما اطلعت الله و رسوله فاذا عصيت الله و رسوله فلا طاعة لي عليكم۔(۴۳)

- ## مقصد ریاست اور بین الریاستی تعلقات

عہد خلافت راشدہ کا مطالعہ بتایا ہے کہ ایک اسلامی مملکت خاص مقصدیت کی حامل ریاست ہوتی ہے۔جغرافیائی سرحدیں، ہجوم انسانی اور حاکیت انسانی، اسکا مقصود و مطلوب نہیں بلکہ اس ریاست کا مقصد منشائے الٰہی کے مطابق انسانی معاشرے کی اصلاح اور فلاح ہے۔اس مقصد وجود کو پورا کرنے کے لئے، خلافت راشدہ کی پوری حکومتی مشینری 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے مرکز و محور پر یکسو رہی تھی۔

ریاستیں عموماً عوام الناس کی اخلاقی تربیت کے معاملہ میں لاپرواہ اور غیر جانبدار ہی رہتی ہیں۔جمہوری ریاست کا تو تصور ہی لوگوں کی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔وہ عوام کی اخلاقی حالت کی نگرانی اور معاشرتی زندگی میں تبدیلی کی مجاز نہیں ہوتی۔جبکہ خلافت اسلامی کی بنیادی ذمہ داری ہی افراد معاشرہ میں اچھائیوں کو فروغ دینا اور برائیوں سے دور رکھنا ہوتا ہے۔

خلافت راشدہ کی حکومت کو اس مقصدیت نے اس دور کی دیگر تمام ریاستوں سے منفرد نوعیت کی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا جس کی خارجہ پالیسی میں بھی یہی مقصد نمایاں تھا۔یہ مقصد ایک ہمہ گیر وسعت رکھتا ہے جسکی تکمیل کے لحاظ سے، وہ کسی خاص قبیلہ، قوم اور وطن تک محدود نہیں رہ سکتی۔۔۔وہ ہر دم وسعت پذیر ہوتی ہے مگر اس کی توسیع مذکورہ بالا مقصد کی خاطر ہی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کی توسیع کسی انتقام، کسی قومی عصبیت، معاشی اقدام اور ملکی سرحدوں میں اضافہ کو بنیاد بنا کر نہیں ہوئی بلکہ انسانیت کو ظلم و جہالت سے نجات دلانے اور صلاح و فلاح سے روشناس کروانے کی خاطر ہی ہوئی۔

خلافت اسلامی کا دیگر ریاستوں سے دوستی اور دشمنی کا معیار یہی دو اصول رہے: ظلم و استیصال سے پاک معاشرہ اور انسانیت کی اصلاح و فلاح۔

اس انفرادیت کا اظہار سفارت کاری کے ساتھ ساتھ معرکہ آرائی میں بھی یوں ہوتا رہا کہ ہر جنگ سے پہلے اسلامی فوج، مخالف حکومت وریاست میں مقاتلین (یعنی لڑنے والے، فوجی) اور غیر مقاتلین (عام شہری) کو علیحدہ کر لیتی۔

عورتوں، بچوں، معذوروں اور مذہبی پیشواؤں سے تعرض نہ کرتی۔ پھر اہل جنگ کو بھی پہلے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جاتی۔ اگر یہ شرط نامنظور ہوتی تو جزیہ دے کر عدل وانصاف پر مبنی اسلامی معاشرے کا حصہ بن جانے کی ترغیب دی جاتی۔ اگر یہ شرط قبول نہ کی جاتی تو پھر تلوار کو فیصلے کی بنیاد بنایا جاتا۔

قوت کے استعمال اور معرکہ آرائی کے اصولوں کے اعتبار سے بھی خلافت اسلامی نے انسانیت کو پہلی بار، مقاصد جنگ کی پاکیزگی اور آداب جنگ کی انقلابی اصلاحات سے روشناس کروایا۔

خلافت راشدہ کے ابتدائی دور سے ہی روم و ایران کی سلطنتوں نے جب اسلامی ریاست میں انتشار کی حوصلہ افزائی کی تو خلیفۂ اول نے دفاعی حکمت عملی کے تحت، اس فوجی کار روائی کو جاری رکھنے کا حکم دیا جس کی تیاری خود رسول خداﷺ کی ہدایت سے ہو چکی تھی، مگر اپنی فوج کو یہ حتمی ہدایات دیں:

خیانت نہ کرنا، دھوکہ نہ دینا، امیر کی نافرمانی نہ کرنا، کسی شخص کے اعضاء مت کاٹنا، کسی بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا، کھجور یا کسی پھلدار درخت کو مت کاٹنا۔۔۔ عبادت گاہوں میں مصروف لوگوں سے تعرض نہ کرنا۔ (۴۴)

اب اس سے بہتر خارجہ اور دفاعی پالیسی اور کیا ہوگی کہ غیر مسلموں کے مذہب اور معابد کا احترام، ان کے حقوق کی نگہبانی اور انصاف رسانی، ان کے ساتھ معاہدوں کی پابندی، ان کی خوشحالی کی ضمانت اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری اسلام نے قبول کی ہے۔ (۴۵)

فصل دوم

خلافت راشدہ کے معاشرتی احسانات

قرون وسطیٰ میں دنیا کے سماجی ومعاشرتی حالات کا مطالعہ یہ بات واضح کرتا ہے کہ انسانی معاشرت، بطور خاص مغرب یا روم اور اس کے زیر اقتدار ریاستیں ایک سماجی بحران کا شکار رہیں۔ ثقافت بے رنگ، فکر پریشان اور تہذیب بنجر دکھائی دیتی ہے۔ جہاں انسان اپنے مقام سے بے خبر، حقوق سے نا آشنا، شعوری زندگی سے دور اور انفرادی آزادی کے کمال وجمال سے بے بہرہ ہو۔

ایسے میں سرزمین عرب کی خلافت اسلامیہ ایک نئی انسانی تہذیب کی بنیادیں رکھ رہی تھی جو آگے چل کر علمی وسائنسی کارناموں سے بھرپور، حریت فکر اور آزادی اظہار کی علمبردار، ایک خوشحال وخوشگوار تمدن میں ڈھل گئی۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک سیاسی حاکمیت نے اسے منظم کئے رکھا۔ اور پھر وہ رہتی دنیا تک کے لئے دنیا کی مثالی تہذیب کے طور پر انسانوں کی زندگیوں میں رچ بس گئی۔ بعد میں آنے والی صدیوں کے لئے ایک نئے انسان نے جنم لیا جو نئے شعور، آزاد فکر اور تسخیر کائنات کی تحریک کا سرگرم کارکن بن کے ابھرا۔۔۔۔ خود مغرب کے مصنف اس حقیقت کا برملا اظہار، کھلے الفاظ میں کرتے ہیں کہ اسلام نے خطۂ عرب کے ذریعے دنیا کو لازوال انسانی خزانوں سے مالا مال کر دیا:

After the death of the Prophet, sterile Arabia seems to have been converted as if by magic into a nursery of heroes, the like of whom, both in number and quality is hard to find anywhere.(1)

انسان کی اس پرواز کے پس منظر میں خلافت راشدہ کا بنیادی کردار ہے جس کو کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔ انسانی تاریخ کے اس قابل فخر دور میں انسان کو نہ صرف مقام انسانیت کا شعور عطا کیا گیا بلکہ اسے، اس مقام کے تحفظ کے اصول بھی بتائے گئے اور خلافت کے نظام کے تحت اس کے اس مقام کو بھرپور تحفظ دیدیا گیا۔ انسان کو تمدنی فرائض کی ادائیگی میں اس طرح مگن کیا گیا کہ معاشرے کے حقوق خود بخود ادا ہونے لگے۔ حقوق وفرائض کے اس توازن نے رہتی دنیا تک کے لیے اصول واقدار کا مینارۂ نور قائم کردیا، جس کی ایک مختصر سی جھلک، ہم تاریخ کے جھروکوں سے، درج ذیل عنوانات سے دیکھ سکتے ہیں۔

مقام انسانی کا شعور اور اس کا تحفظ

قرآن وسنت کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق انسان کا اس دنیا میں مقام اور حیثیت یہ ہے کہ وہ خالق کائنات کا نائب، نمائندہ، امین، عبد اور اس کے سامنے جوابدہ ہے۔ (۴)

اس مقام انسانی کا سیاسی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے خدا کے عطا کردہ اختیارات، جوابدہی کے احساس کے ساتھ اور نیابت الٰہی کے مرتبہ عالی کے مطابق، استعمال کرے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانی سماج میں ریاست وحاکمیت کا ادارہ، افراد معاشرہ کی نگرانی کرے مگر اسے ضروری مواقع اور وسائل بھی مہیا کرے۔ سماجی نظام، فرد کی تربیت یوں کرے کہ وہ دیگر انسانوں کے حوالے سے ایک محتاط اور مفید طرز زندگی اپنائے تاکہ اجتماعی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی عام نہ ہو۔ عدل اور خیر خواہی، اس کے مزاج کا مستقل حصہ بن جائیں۔ اسطرح وہ ایک مفید اور فیض رساں شہری بن سکیگا۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو ایسے مواقع مہیا کرے جن سے ایسا طریق زندگی رواج پاسکے اور خلاف ورزی کی صورت میں اسکا احتساب عمل میں آجائے۔

خلافت اسلامی نے مقام انسانیت کا شعور عام کرنے اور اس مقام کا تحفظ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ خلفائے راشدین کا اپنی اطاعت کو خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط کرنا دراصل اسی سلسلہ کی بنیادی کڑی ہے۔ اس شرط کے بغیر کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے پر حکمرانی کرے، ہر فرد اپنی حیثیت میں آزاد اور محترم ہے۔ اس مقام انسانی کا

تصور اور تحفظ خلیفہ اول نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں یوں واضح کیا کہ:

و الضعيف فيكم قوي عندي حتىٰ اريح عليه حقه ان شاء اللّٰه و القوي فيكم ضعيف عندى حتىٰ أخذ منه ان شاء الله ۔(۳)

'تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلوا دوں، اگر خدا چاہے۔ اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کرلوں '

گویا ریاست اسلامی میں کسی فرد کا مقام حقوق و فرائض کی ادائیگی اور عدم ادائیگی کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے اور خلافت کا ادارہ ہر دو صورتوں میں اس کے اصل مقام کا خیال رکھے گا۔ دوسری طرف یہ حق حکمرانوں کو بھی کسی صورت میں حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے تحت رہنے والے افراد معاشرہ کے ساتھ ان کے مقام سے گرا ہوا سلوک کریں۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عمال کے نام ہدایت نامے میں اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ: تم عوام کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک نہ بن جاؤ۔(۴)

اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی تقریر میں عوام الناس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: یہ ضروری ہے کہ میں تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کاروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے۔(۵) بطور انسان کے، جو تقدس ہر آدمی کے ساتھ وابستہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد قانون کی نظر میں ریاست کے اندر برابر اور مساوی حقوق رکھتا ہے۔ ایک سردار اور رعایا کے درمیان آئینی حقوق کے لحاظ سے فرق اور امتیاز روا رکھنے سے غیر متوازن معاشرہ تخلیق پاتا ہے۔ اسی اصول کے تحت ہم دیکھتے ہیں کہ، تمیز بندہ وآقا کی خلیج، خلافت راشدہ کے دور میں کہیں نظر نہیں آتی۔ حضرت علیؓ کا، ان کی ذرہ چوری کرنے والے غیر مسلم کے ساتھ رویہ، اس سلسلہ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ آپ نے اپنی سرکاری حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے اپنی ذرہ قبضہ میں نہیں لی بلکہ عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ قاضی نے جو کہ اسی خلافت کے نظام کا محافظ ہے، گواہ طلب کیئے۔ آپ پیش نہ کر سکے تو فیصلہ، خلیفہء وقت کے خلاف ہوا۔ آفرین انسانی حقوق کے اس علمبردار پر کہ جب فیصلہ ہوگیا، تو ملزم عیسائی نے حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ ذرہ واقعی آپ کی ہے، واپس لے لیں، مگر آپ نے انکار کیا اور کہا کہ اب

آپ کی ہے۔(۶)

ایک اور مثال دیکھیے، ریاست غسان کا فرمانروا (جبلہ بن ایہم) جو اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دفعہ طواف کعبہ میں مصروف تھا کہ ایک بدو کا پاؤں اس کی چادر پر آ گیا۔ سردا۔ نے بدو کو طمانچہ دے مارا۔ بدو نے فوراً بدلہ چکا دیا تو جبلہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی اور بتایا کہ ہمارے ہاں اگر کوئی ایسی گستاخی کرے تو ہم اسے قتل کر دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسے جواب دیا کہ اسلام نے اعلیٰ و ادنیٰ درجوں کو قانون کی نظر میں ایک کر دیا ہے۔(۷)

حقوق انسانی کی ادائیگی اور حفاظت

اسلامی ریاست میں شہری دو طرح کے تھے۔ ایک مسلمان اور دوسرے اہل عہد (معاہد یا ذمی)۔ خلافت راشدہ کی فلاحی مملکت میں اہل عہد کے خصوصی حقوق کا تعین با قاعدہ طور پر موجود تھا اور خلفاء اربعہ خود، سختی کے ساتھ اس ضابطے پر عمل درآمد کرواتے تھے۔ جان و مال کا تحفظ، حق ملکیت اور اس کا تحفظ، عزت و آبرو کا خیال اور ہتک عزت کا مداوئی لے اس سب کچھ کو ریاست کی بنیادی ذمہ داری سمجھا جاتا رہا اور خلاف ورزی کی صورت میں کڑا احتساب روا رکھا گیا۔ عدل کی فراہمی اور قانون کی بالاتری کے ذریعے حقوق انسانی کی ادائیگی کو منضبط، شفاف اور ضروری ثابت کیا گیا۔ بے شمار تاریخی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت اسلامی کا یہ خاصہ اسے دنیا کی تمام ریاستوں سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ سید مودودی رقمطراز ہیں کہ:

خلافت راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے (قانون کی بالاتری) کی سختی کے ساتھ پابند رہی، حتی کہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ نے انتہائی نازک اور سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی حدود شرع سے باہر قدم نہ رکھا۔(۸)

اس سلسلہ کی بہترین مثال حضرت عثمان غنیؓ نے یوں فراہم کی کہ آپ نے اپنے خلاف محاصرہ کار باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت یہ کہتے ہوئے نہ دی کہ میں اپنی جان بچانے کی خاطر کئی مسلمانوں کا خون نہیں ہونے دیتا۔

خلافت اسلامی کے دور میں موجود ذمیوں کے حقوق کی تفصیلات، ایک محقق کو متحیر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ حقوق انسانی کا ایسا صاف ستھرا اور مبنی بر انصاف شعور اور پھر اس کے نفاذ

کا عملی ضابطہ، اسلامی ریاست کا قائم کردہ ایسا مینارۂ نور ہے جس سے تاریخ انسانی پہلی دفعہ روشناس ہوئی اور تاابد مستفیض ہوتی رہے گی۔

مئورخ یعقوبی نے خلیفہ ثانی کے دور کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ عمرو بن العاص (فاتح مصر) کے بیٹے نے ایک قبطی عیسائی کو مارا پیٹا۔ مقدمہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے مجمع عام میں سزا دلوائی اور باپ بیٹے سے مخاطب ہو کر وہ جملہ ادا فرمایا جو تاریخ میں حقوق انسانی کی ضمانت ٹھہرا کہ: تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا ہے؟ حالانکہ ان کی ماں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔(۹)

اسی طرح حضرت علیؓ کے سامنے اہل حیرہ کے ایک شخص کا مقدمہ پیش ہوا جس کے بیٹے کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا تھا۔ آپ نے گواہی لینے کے بعد قاتل سے قصاص لیے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ ذمی کو مسلمانوں نے دیت پر راضی کر لیا اور اس نے حضرت علیؓ کو طے پانے والے معاہدے کی تفصیل بتائی۔ خلیفہ نے اس معاہدے کو اس وقت قبول فرمایا جب یہ تصدیق ہوگئی کہ ذمی کو ڈرا دھمکا کر دیت پر راضی نہیں کیا گیا۔ آپؓ نے اس موقع پر مسلمانوں کے مجمع میں فرمایا کہ: میں نے ذمیوں کو وہ حقوق دیئے ہیں کہ ہمارا خون ان کے خون کی طرح اور ہماری دیت ان کی دیت کی مانند ہو جائے۔(۱۰)

سماجی آزادی اور عزت وآبرو کا تحفظ

عہد خلافت میں اسلامی ریاست کے باشندے عدل اجتماعی سے اس طرح بہرہ مند تھے کہ آج کی مہذب ترین سوسائٹی میں بھی اس کا صرف خواب دیکھا جا سکتا ہے۔ افراد معاشرہ کی سماجی آزادی اور ان کی عزت وآبرو کا تحفظ تو یوں لگتا ہے، خلیفہ وقت کی اولین ترجیح میں شامل تھے۔ جب بھی کوئی ایسا مقدمہ خلیفۂ وقت کے سامنے پیش ہوا تو فوراً اس کے ازالے کا اہتمام ہوا اور انصاف ہوتا ہوا نظر آیا۔ ابوموسیٰ اشعری نے ایک شخص کو مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ مانگنے پر کوڑے لگوائے اور سر منڈوا دیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس شکایت پہنچی تو آپ نے فوراً اس کے بدلے کا حکم دیا۔(۱۱) اسی طرح آپ کے عہد میں بنی ہذیل کے کسی شخص نے اپنے میزبان کی لڑکی پر دست درازی کی، اس کے پتھر مارنے سے وہ ڈھیر ہو گیا۔ آپ کے پاس فیصلہ آیا تو آپ نے اسے اللہ کی طرف (سزا کے طور پر) قتیل قرار دیا اور دیت نہ دلوائی۔(۱۲)

ملک شام کے شہر حمص میں امیر عساکر ابوعبیدہ نے جب لوگوں کو جزیہ واپس کرنے کے لئے حکم صادر فرمایا تو شہری حیران ہوئے کہ اغراض کی دنیا میں یوں بھی ہوتا ہے! استفسار پر بتایا کہ ہم یہ جزیہ ذمیوں سے ان کے دفاع اور حفاظت کے عوض میں لیتے ہیں۔ چونکہ ہم اس علاقے سے اپنی فوجیں واپس لے جارہے ہیں اور حفاظت کا فریضہ انجام دینے سے قاصر ہیں لہذا اللہ کی مخلوق کا مال اسے واپس کررہے ہیں۔ حقوق انسانی کا تحفظ اس انداز سے ہوتا دیکھ کر شہریوں کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور ان کے لبوں پر یہ دعائیں آگئیں کہ اللہ ایسے محافظوں کو ہمارے لئے دوبارہ فتح سے ہمکنار کرے اور ہمیں ان کی نگرانی میں زندگی گزارنا نصیب ہو۔ (۱۳)

ایکطرف سرکاری سطح پر، نظام خلافت کے ادارے حقوق خلق میں اسقدر محتاط ہیں اور دوسری طرف انفرادی سطح پر خلفاء کا طرز عمل عجیب مثالیں رقم کررہا ہے کہ حضرت عمرؓ فرات کے کنارے کسی بکری (یا بعض روایات میں کتے) کے بھوکا مرنے کا ذمہ دار اپنے آپ کو قرار دیتے ہیں۔ جو خلیفہ جانوروں کے حقوق کا ایسا پاسبان ہو وہ انسانوں کے لئے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا؟

علامہ عینی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک غلام کو دو قطعے کپڑے خریدنے کے لئے بھیجا۔ جب وہ لے آیا تو آپ نے باریک اور قیمتی کپڑے کا ٹکڑا اسے دیتے ہوئے کہا: تم زیادہ مستحق ہو کہ تم جوان ہو اور زینت و آرائش چاہو گے، دوسرا کپڑا خود رکھ لیا اور فرمایا کہ (میری خیر ہے) میں تو بوڑھا ہو چکا۔ (۱۴)

بلا امتیاز رنگ ونسل اور مقام ومرتبہ، رعایا کی نفسیات تک کا یوں خیال رکھنا، افسانوی ادب اور خیالی دنیا سے نکل کر پہلی دفعہ عملی زندگی میں یوں آیا کہ اسکی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ عہد کی پاسداری کے سنہرے نظائر بھی تاریخ انسانی کے اسی عہد میں نظر آتے ہیں، ورنہ آج کی 'مہذب' دنیا میں بھی یہ معاملہ 'پالیسی' کے منافقانہ رویے کی نظر ہوتا رہتا ہے۔

ایرانی فرمانروا ہرمزان، حضرت عمرؓ کے سامنے گرفتار ہو کر پیش ہوا، اس کے قتل کا فیصلہ صادر ہوا تو اس نے پانی مانگا۔ پھر پانی لینے تک کے لیے جان کی امان مانگی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے 'لا بأس' کہا۔ وہ ایک 'پالیسی' پر چل رہا تھا۔ اس نے پانی پئے بغیر گرادیا (تاکہ نہ پئیوں اور نہ اس وقت تک قتل کیا جاؤں)۔ حضرت انسؓ نے خلیفہ سے کہا کہ آپ اسے قتل نہیں کرسکتے کیونکہ آپ امان دے چکے ہیں۔ گواہی مانگی گئی تو زبیر بن العوامؓ نے گواہی دی کہ امان دی گئی تھی۔ لہذا

اسے چھوڑ دیا گیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمرؓ فاروق نے امیر عساکر کو حکم لکھ بھیجا کہ اگر کسی کو امان دینے کا اشارہ تک کر چکے ہو تو اسے برقرار رکھنا۔(۱۵)

انسانی آزادی کا تحفظ کرنے والوں کی تاریخ میں حضرت علیؓ کے یہ الفاظ سنہرے الفاظ میں نقش ہو گئے ہیں کہ:

مجھے شرم آتی ہے کہ میں ایک انسان کو غلام بناؤں جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے۔(۱۶)

سرزمین عرب کے قبائلی نظام میں خلیفہ وقت کا اقرباء پروری سے مکمل اجتناب بلکہ اپنے خاندان کو سرکاری عہدوں سے دانستہ دور رکھنا بھی ایک انہونی تھی۔ خلفائے راشدین نے سماجی آزادی اور معاشرتی انصاف کے تقاضوں کو مجروح نہ ہونے دیا اور یوں لوگوں کے لئے ایک نئی مثال قائم کر دی۔ اس سلسلہ میں اگرچہ حضرت عثمان غنیؓ کا طرز عمل مختلف نظر آتا ہے مگر انہوں نے بھی صلہ رحمی کے جذبے کے تحت اپنے خاندان میں سے اپنے اعتماد کے آدمیوں کو سرکاری عہدے دیئے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انہوں نے اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ایسا کام کر کے دکھایا جو توقعات سے بڑھ کر تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے بعد ہونے والے ایک متوقع خلیفہ کو یہ وصیت کی تھی کہ: اگر میرے بعد تم خلیفہ بنو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔(۱۷)

گویا آپ کو انسان کی سماجی آزادی اور معاشرتی حقوق کا اس قدر احساس تھا کہ خود اپنے دور خلافت میں تو اس کا خیال رکھتے ہی رہے، آنے والے خلفاء کو بھی تاکید کر گئے کہ ایسی غلطی سے مجتنب رہنا جس سے امت کے اجتماعی شعور وضمیر پر بوجھ پڑے اور خالق کی دی ہوئی نعمتوں سے وہ محروم رہ جائیں۔

رعایا کی آزادئ رائے کا احترام

خلیفہ اول کی پہلی تقریر جو آپ نے بیعت عام کے بعد شہریوں کے اجتماع عام میں کی، اس کے الفاظ تھے کہ:

"اگر آپ چاہیں تو اصحاب رسول ﷺ میں سے کسی اور کو چن لیں، میری بیعت آپ

کے راستے میں حائل نہیں ہوگی'۔ اور یہ کہ 'اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجئے اور اگر غلط کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے'۔ (۱۸)

رضا کارانہ بیعت اطاعت کی بنیاد پر منتخب خلیفہ کا عوام الناس کو حق احتساب دینا اور اپنی اصلاح کا اختیار بھی انہیں عطا کرنا، سونے پہ سہاگہ والی بات ہے۔ حریت فکر، اور آزادی اظہار کے تحفظ کی ضمانت اس سے بہتر طریقے سے بھی فراہم کی جاسکتی ہے؟ تاریخ ایسی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے آئندہ خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں ایک چھ رکنی کمیٹی بنائی تھی۔ آپ نے ان افراد سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے شورے کے بغیر زبردستی امیر بننے کی کوشش کرے اسے قتل کردو۔ (۱۹)

یعنی وہ اتنا بڑا جرم کرے گا کہ اس کی سزا موت سے کم نہیں ہوسکتی۔ حضرت علیؓ کو شہادت عثمانؓ کے بعد عہدۂ خلافت سنبھالنے کے لئے باصرار کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میری بیعت خفیہ طریقے سے نہیں ہوسکتی، یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہی ہوگی۔ (۲۰)

امام ابو یوسف نے حضرت عمرؓ کی ایک مجلس شوریٰ کا حوالہ دیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلفاء راشدین کے ذہنوں میں حکومت سنبھالنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ عوام کو محض حاکم کی مرضی اور خواہش کا غلام بن کے نہیں رہنا چاہیے بلکہ وہ اپنی آزاد سوچ رکھنے اور اس کا آزادی کے ساتھ اظہار کرنے کا مکمل حق رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں فرمایا:

آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہشات کی پیروی کریں۔ (۲۱)

یہ بات اب خلیفۂ وقت کی طرف سے خود کہی جارہی ہے، حالانکہ اس طرح کا حق لینے کا مطالبہ تو شوریٰ کے افراد کی طرف سے آنا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ عملاً اس اصول پر عمل پیرا تھے۔ لہذا لوگوں کو اس بات کا مطالبہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دوسرا یہ کہ آپ لوگوں کے اندر حریت فکر اور آزادیٔ اظہار کے لئے موجود عنصر کو حوصلہ دینا چاہتے تھے اور ان اقدار کی آبیاری کو امت کے لئے اور افراد شوریٰ کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔۔۔ اد. گا ہے گا ہے

اس بات کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے جسے تاریخ نے محفوظ کیا ہے۔ایک دفعہ آپ نے لوگوں کی مجلس میں یہ کہا کہ اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کرلوں تو تم کیا کرو گے؟ حضرت بشر بن سعد نے کہا ''اگر آپ نے ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کردیں گے۔اس پر آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کی ''تب تو تم کام کے لوگ ہو!''۔(۲۲)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ امت کے اجتماعی ضمیر کو بیدار رکھنے کے متمنی تھے۔ان میں سوچنے سمجھنے کی قوت اور رائے کے اظہار کی جرأت پیدا کرنا چاہتے تھے۔مذکورۃ الصدر ابو موسیٰ اشعری کے ایک شخص کو کوڑے لگوانے والے معاملے میں آپ نے عجیب بات کی۔

ہوا یوں کہ متاثرہ شخص اپنے بالوں کو لے کر مدینہ پہنچا اور جاتے ہی بالوں کا گچھا بنا کر خلیفۂ ثانی عمر فاروقؓ کے سینے پر دے مارا اور بڑے اکھڑ لہجے میں بولا: بخدا آگ! میرے ساتھ یہ ظلم ہوا۔ میں بہت بلند آواز اور دشمن پر دباؤ ڈالنے والا انسان ہوں۔آپ نے اس کی گستاخی پر غضبناک ہونے کے بجائے اسے خراج تحسین پیش کیا اور فرمایا:

بخدا! اگر سارے لوگ اس جیسے عزم والے ہوں تو یہ بات مجھے اس سارے مال غنیمت سے زیادہ عزیز ہے جو اب تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ (۲۳)

یاد رہے کہ خلفائے راشدین میں خلیفۂ ثانی کا ہی تو دور تھا جب سب سے زیادہ فتوحات ہوئیں اور سب سے زیادہ مال غنیمت جمع ہوا مگر امیر المؤمنین اس مال و دولت سے اہم اس بات کو قرار دے رہے ہیں کہ لوگوں میں حریت فکر پیدا ہو اور وہ اظہار رائے کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔

حضرت علیؓ کے سامنے ایک دفعہ کچھ خارجیوں کو گرفتار کر کے لایا گیا وہ آپ کے منہ پر آپ کو گالیاں دیتے رہے۔ان میں سے ایک خدا کی قسم اٹھا کے آپ کو قتل کرنے کا برملا ارادہ دہرائے جا رہا تھا۔لوگوں کے کہنے کے باوجود آپ نے نہ صرف سزا دینے سے احتراز کیا بلکہ یہ فرمایا کہ جب تک عملاً کوئی کارروائی ان سے سرزد نہ ہو جائے جو قابل گرفت ہو تو محض زبانی مخالفت کی بنیاد پر سزا نہیں دی جائے گی۔(۲۴)

تاریخی حقائق بتاتے ہیں خلفائے راشدین نے محض ایسی 'نیک خواہشات' نہیں رکھیں بلکہ اپنے طرز عمل اور طرز حکومت سے یہ ثابت کیا کہ ان کی حکومت کی اولیں ترجیح لوگوں کو قانونی

مساوات، سماجی آزادی، اجتماعی عدل اور اظہار رائے کی آزادی سے ہمکنار کرنا ہے۔ یہاں تک کہ بیعت جیسے بنیادی ادارے کی خلاف ورزی کرنے والوں کی عزت نفس کو مجروح نہیں کیا گیا۔ قانونی لحاظ سے بیعت نہ کرنے والوں سے پوچھ گچھ کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے، بلکہ بعد کے دور میں اس بنیاد پر کئی حادثے بھی ہوئے ہیں۔ مگر خلیفہ اول نے حضرت سعد بن عبادہ کے بیعت نہ کرنے کے باوجود ان سے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر اور دیگر کچھ اصحاب نے بیعت نہیں کی مگر نہ صرف یہ کہ آپ نے ان سے تعرض نہیں کیا بلکہ ان کے بارے میں دوسروں کو یہ ضمانت دیتے رہے کہ ان سے کسی فتنے کا اندیشہ نہیں۔ (۲۵)

ایسے خلیفہ کے بیٹے کو دور خلافت کے بعد، محض بیعت نہ کرنے پر خاندان کے معصوم بچوں سمیت شہید کر دیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ خلفائے راشدین اس حریت فکر اور اظہار رائے کی آزادی سے کئی سیاسی نقصان تو برداشت کر لیتے مگر امت کے شعور اور ضمیر پر پہرے بٹھانے سے گریز کیا۔

مقام نسواں کا تحفظ

قرآن حکیم اور اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں خواتین کا معاشرے میں جو مقام، حیثیت اور ذمہ داری بنتی ہے، اس کا مکمل عملی مظاہرہ دور خلافتِ راشدہ میں نظر آتا ہے۔ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ عورت کو معاشرے میں باوقار شہری کی جگہ اور اس کے حقوق عطا ہوئے۔ اسلام نے عورت کو باعزت زندگی، تعلیم، وراثت اور دیگر معاشرتی حقوق سے نوازا۔ (۲۶)

خلفائے راشدین نے اس مقام نسواں کے تحفظ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ خواتین نے معاشرے کی اسلامی خطوط پر استواری میں حکومت کا بھرپور ساتھ دیا۔ نسل نو کی تربیت، مجاہدین کی تیاری، جنگوں میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور تحصیل و ترویج علم میں مکمل معاونت کی۔ اس سب کچھ کے ساتھ وہ خانگی امور اور اندرون خانہ سرگرمیوں میں بھی مصروف رہیں۔

اہل الرائے خواتین کے ساتھ امور سلطنت کے بارے میں خلفاء کا مشورہ بھی تاریخ نے محفوظ کیا ہے۔ امہات المؤمنین کی آرا اور دیگر صحابیات کے مشورے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک صحابیہ شفا بنت عبداللہ سے بعض اہم معاملات میں رائے لی اور

انہیں بازار (میں قیمتوں وغیرہ) کی نگرانی پر مامور بھی کیا۔ آپ کے عہد میں خواتین نے جنگوں میں حصہ لیا۔ مثلاً جنگ یرموک میں حضرت اسماء بنت یزید۔ (۲۷)

اسی طرح اس دور میں خواتین، عدالتوں میں حاضر ہو کر گواہی بھی دیتیں۔ مثلاً حضرت علیؓ کی عدالت میں چار عورتوں نے ایک عورت کے خلاف گواہی دی کہ اس نے پاؤں تلے بچہ روند ڈالا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شوہر کے خلاف بیوی کو طلاق دینے کے واقعہ میں چار عورتوں کی شہادت کو قبول کیا۔ (۲۸)

خواتین معاشرہ کا کردار خلفائے راشدین کے دور میں نہ صرف اجتماعی کاموں میں ہاتھ بٹانے تک محدود تھا بلکہ ان کی طرف سے خلفاء پر تعمیری تنقید بھی جاری رہتی۔ مثلاً ایک دفعہ خلیفۂ ثانی کو سرراہ روک کر ایک خاتون نے کہا: اے عمر! رعایا کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ جب آپ کے ساتھی نے اسے ٹوکنا چاہا تو آپ نے منع کر دیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ خطبۂ جمعہ میں حق مہر کی رقم مقرر کرنے کا حکم دے رہے تھے کہ ایک عورت نے ٹوک دیا اور ان کی رائے کے مقابلے میں قرآن سے دلیل دی تو خلیفہ نے اپنی رائے تبدیل کر لی۔ (۲۹)

معاشی تحفظ اور نجی زندگی کی آزادی وسلامتی

دین اسلام کے طے کردہ انسانی مقام و مرتبہ کی روشنی میں خلفائے راشدین نے ہر ایک فرد معاشرہ کو محترم اور مفید جان کر اس کی خدمت کی۔ وہ انسان میں حقوق وفرائض کے توازن کو قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی جدوجہد میں رہے۔ اس سلسلہ میں مسلم و غیر مسلم اور غریب و امیر یا اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی طبقاتی تقسیم نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو رعایا کی زندگیوں کا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ معاشی زندگی کا تحفظ، سماجی عدل کی فراہمی اور افراد کی نجی زندگی کی آزادی کی خاطر اپنے آپ کو ہر وقت بے چین کئے رکھتے تھے۔ اپنی رعایا میں ایک معصوم انسانی بچے کے بلکنے سے لے کر دور دراز جنگلوں میں جانور کے بھوکا رہنے تک کا احساس ہر وقت ان کے حرز جاں تھا۔ ضرورتمندوں، یتامیٰ، مساکین اور فقراء کے باقاعدہ رجسٹر اور اندراج موجود تھے جن کی بنیاد پر حکومت ایسے لوگوں کی مسلسل خبر گیری کرتی رہتی تھی۔

خلیفۂ ثانی نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اسے گھر لے گئے اور بیت المال

کے ذمہ دار کو بلا کر اس کا روزینہ مقرر کروایا۔ اس موقع پر آپ نے یہ الفاظ کہے کہ:

خدا کی قسم! یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی سے جزیہ لے کر کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔ (۳۰)

آپکے عہد خلافت میں نومولود بچوں کے وظائف مقرر تھے۔ اسی طرح خلیفۂ ثالث کے حوالے سے ایک محترم خاتون کا بیان ہے کہ:

فأرسل الي بخمسين درهما و شقيقة سنلانية، ثم قال : هذا عطاء ابنك، و هذا كسوته، فاذا مرت به سنة رفعناه الى مائة. (۳۱)

(بچے کی ولادت پر مجھے امیر المؤمنین نے) پچاس درہم اور ایک چادر بھیجی اور کہلا بھیجا کہ یہ آپ کے بچے کا وظیفہ ہے، جب یہ ایک سال کا ہو جائے تو ہم اس کا وظیفہ بڑھا دیں گے۔

اس سلسلہ میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ سرکاری اداروں کا سلوک سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کے جان و مال کا تحفظ، عزت و آبرو کی ضمانت، انہیں معاشی حقوق کی فراہمی کے ساتھ جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں فیاضانہ برتاؤ بے مثال رہا۔ چار ماہ تک جزیے میں چھوٹ اور سال بھر اسلامی ریاست کی حفاظت میں رہنے پر جزیہ کی ادائیگی جاری رہی۔ غریب، کمزور، معذور افراد کو نہ صرف جزیہ معاف ہوتا بلکہ ان کے وظائف جاری کئے جاتے۔ (۳۲)

کتاب الاموال میں حضرت عمر کے ایک غلام کی روایت درج ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ خواتین اور بچوں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ (۳۳)

معاشی پہلوؤں سے قانونی مساوات کی ایک اور نادر مثال قاضی شریح کا وہ فیصلہ ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے مقابلہ میں عام شہری کے حق میں دیا۔ ہوا یوں کہ خلیفۂ ثانی نے ایک گھوڑا خریدا۔ جب سودا ہو گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے تو گھوڑا گرنے سے زخمی ہو گیا۔ آپ نے اسے مالک کو واپس کرنا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کیا۔ عدالت میں معاملہ لے جایا گیا تو قاضی نے فیصلہ گھوڑے کے مالک کے حق میں دیا اور خلیفہ سے کہا کہ آپ اگر واپس کرنا چاہتے ہیں تو گھوڑے کو اسی حالت میں کر سکتے ہیں جس طرح آپ نے لیا تھا (یعنی زخم کے بغیر۔۔۔)۔ (۳۴)

شہریوں کی نجی زندگی میں حکومتی دخل اندازی کو بھی خلافت اسلامیہ نے ناپسند کیا۔

قرآن مجید نے زندگی کے جن نجی حقوق کی تفصیل کے ساتھ ہدایت فرمائی ہے، خلفائے راشدین نے ان کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھا۔ یہ سب کچھ اس زمانے میں ہو رہا تھا جب انسان کو ان نجی حقوق کی خبر تک نہ تھی۔

مذہب وعقیدے کی آزادی، معاشی زندگی اور حقوق ملکیت، قانون وراثت اور تحفظ آبرو، جیسے اقدام خلافت راشدہ کے تاریخی کارنامے ہیں۔ اسی طرح دوسروں کے خلاف کسی شہری کا یا سرکاری ادارے کا تجسس، پراپیگنڈہ، غیبت، الزام تراشی وغیرہ پر سختی سے پابندی قائم رکھنا اصول استیذان، معاشرتی زندگی میں اور شک کا فائدہ، سزا کے معاملات میں۔۔۔۔ یہ وہ سنہرے اصول ہیں جو تاریخ انسانی نے صرف خلافت اسلامی کے دور میں دیکھے ہیں۔

خلیفۂ اول نے حضرت عمرو بن العاص کو شام وفلسطین کی طرف مہم پر روانہ کرتے ہوئے فرمایا تھا'' اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہاری اولاد ہیں۔ لوگوں کے راز نہ ٹٹولو اور ان کے ظاہر پر ہی ان سے معاملہ کرو۔ (۳۵)

حضرت عمر کا ایک واقعہ تاریخ میں انوکھا نظر آتا ہے۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے آپ نے کسی گھر کے اندر سے موسیقی کی آواز سنی۔ دیوار پھلانگ کر اندر گئے تو شراب وشباب نظر آئے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر آپ برہم ہوئے مگر شہری کے اعتراض نے انہیں لاجواب کر دیا۔ اس نے کہا کہ میرا جرم ایک طرف مگر امیر المومنین ! آپ نے حکم الٰہی کی تین خلاف ورزیاں کی ہیں، ایک تجسس کیا، دوسرے دیوار پھلانگی، تیسرا بغیر اجازت میرے گھر میں داخل ہوئے۔۔ یہ سننا تھا کہ جلالت وعظمت کے پہاڑ عمر فاروق نے بجائے غصہ ہونے کے اسے سرزنش کرنے پر ہی چھوڑ دیا۔ (۳۶)

عجیب بات ہے، پہلے ایسے حقوق کا لوگوں کو شعور خود دیا، پھر اس کا تحفظ بھی کرتے رہے اور اگر ایک جگہ خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے تو شہری کو احتساب کرنے کا حق بھی دیا۔ اسے انا کا مسئلہ اور عناد کی جڑ نہیں بننے دیا۔ سلام ایسی پاکیزہ ہستیوں پر جو عالی مرتبہ ہونے کے باوجود اتنی عاجزی وانکساری سے رہے۔ اپنی رعیت کے سارے حقوق کو اپنے فرائض سمجھ کر پورے کرتے رہے۔ رعایا کو جرأت اظہار، حریت فکر اور 'حق احتساب' عطا کرتے رہے۔

اصلاح معاشرہ اور انسانی اوصاف کی نشوونما

خلافت راشدہ کا انسانی معاشرے کے لئے یہ بھی ایک منفرد تحفہ ہے جو حکومتوں کی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اور بھی قیمتی اور نمایاں نظر آتا ہے۔ خلفائے راشدین امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا قرآنی فریضہ ادا کرتے ہوئے معاشرے کی اصلاح اور افراد معاشرہ کی تعمیر سیرت و کردار کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔

فرد، معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اس کے بگڑنے یا سنورنے سے ہی معاشرے تخریب یا تعمیر کے راستوں پر چلتے ہیں۔ جناب رسول کریم ﷺ کی جانشینی کا مطلب ہی یہ تھا کہ معاشرے کو تعمیر انسانیت کی راہوں پر جاری وساری رکھا جائے اور اس سلسلہ میں خلافت راشدہ کسی وقت بھی غافل نہ ہوئی۔

اسلامی ریاست وحکومت جہاں عوام الناس کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے وہاں وہ ان کی اخلاقی نگرانی اور روحانی تعمیر وتہذیب بھی اپنے ذمہ لیتی ہے۔ لہذا خلفاء راشدین کی یہ مستقل حکمت عملی رہی کہ ریاست کے ان دو بنیادی ستونوں کو کمزور نہ ہونے دیا جائے۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے قانونی حاکمیت اور عدل وانصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ انسانی مساوات کی عظیم مثالیں پیش کیں۔ ریاست کی طرف سے عوام کو آزاد معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے مواقع اور وسائل مہیا کئے۔ وعظ ونصیحت سے بڑھ کر اپنے عمل کے ٹھوس اور قابل تقلید نمونے پیش کئے اور قانون کے بے لاگ نفاذ کے ذریعے اصلاح معاشرہ اور اعلیٰ اوصاف انسانی کی نشوونما کو یقینی بنایا۔

خلیفہ اول نے اپنی پہلی تقریر میں ہی لوگوں کو معروف کی برکتوں اور منکرات کی نحوستوں سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔۔۔۔۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ (۳۷)

تمام خلفاء نے اپنی رعایا کو یہ شعور دینا ضروری سمجھا کہ ان کی اطاعت صرف معروف میں کی جائے۔ منکرات میں نہ صرف ان کی اطاعت قطعاً ضروری نہیں بلکہ اس کے خلاف ردعمل کا برملا اظہار کیا جائے۔ افراد معاشرہ کے حقوق کا تحفظ اور حکمرانوں کے احتساب کا یہ دوگونہ اصول صرف خلافت راشدہ نے ہی انسانوں کو عطا کیا۔ انسان تو مطلق العنان بننا چاہتا ہے کجا کہ حاکم

بننے کے بعد لوگوں کو اپنے اختیارات پر حد لگانے کا نہ صرف اختیار دے دیا جائے بلکہ انہیں اس کا طریق کار اور معیار بھی عطا کر دیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ اپنے عمال کو ہدایت فرماتے کہ: تمہیں رعایا کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جانے کے لئے عامل نہیں مقرر کیا بلکہ اس لئے تمہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو، لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو، عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو۔ بقول خلیفۂ اول: اپنے آپ کو درست رکھو، تمہاری رعیت بھی درست رہے گی۔ اس مقصد کی خاطر خلفاء خود گشت کرتے اور منکرات کا سد باب کرتے۔ (۳۸)

عمال کی تقرری کے وقت انہیں سرکاری فرمان کے ذریعے اپنی اصلاح اور لوگوں کے اخلاق کی نگرانی کی ہدایات دی جاتیں۔ عمال سے اپنی حدود میں رہنے اور عوام کی تعمیر و تہذیب پر لگے رہنے کے عہد لئے جاتے۔ پر تعیش زندگی گزارنے پر ان کی سخت تادیب ہوتی، لوگوں کی شکایت پر حکام کو تبدیل کر دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے عیاض بن غنم، عامل مصر کو بیش قیمت لباس پہننے اور محل بنانے کی شکایت پر کمبل کا کرتا پہنوایا اور انہیں بکریاں چرانے پر لگا دیا۔ (۳۹) مقصد یہ کہ ایسا فرد لوگوں پر حکمران نہیں رہنا چاہیے کہ جس کے کردار کو دیکھ کر اصراف، عیاشی اور لاپرواہی رعایا میں بھی پنپنے لگے۔ حضرت علیؓ اخلاقی نگرانی کی زبانی و تحریری ہدایات کے علاوہ اصلاحی وفود بھیجتے جس سے عمال کی تحقیقات و نگرانی مقصود ہوتی۔ (۴۰)

خلفائے راشدین کی سیرتوں کا مطالعہ انسان کی آنکھیں کھولتا ہے کہ ایسے حکمران بھی دنیا میں ہو سکتے ہیں جو بیک وقت امام، مرشد، نگران، سربراہ اور خادم ہوں۔

نخلستانِ انسانی کے یہ باغبان ـــــ جب انسانی معاشرے کے قائد بنے تو ایک ذمہ دار اور باضمیر معاشرہ پیدا ہوا۔ جو تعمیر کے اصولوں کا متلاشی اور تخریب کی سرگرمیوں سے مسلسل گریزاں ہوتا تھا۔ محنت، دیانت اور خود احتسابی کے بنیادی اوصاف کی نشو و نما نے عرب کی انسانی اجتماعیت کو اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار سے مزین کر دیا تھا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول نے ان کے اندر اچھائی پھیلانے کی اتنی جرأت بھر دی تھی کہ وہ خلیفۂ وقت کو ٹوک کر صحیح رخ پر لگا لیتے تھے۔

خلافت راشدہ کے یہ وہ معاشرتی احسانات ہیں جو آج تک آنے والی انسانی حکومتوں

کے لئے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ان زریں اصولوں سے نہ صرف مسلمان حکومتیں فیضیاب ہوتی رہتی ہیں بلکہ انسان کے اجتماعی شعور نے، ان سے فائدہ حاصل کر کے، آج فلاحی معاشرے تخلیق کرنے کی ہمت کی ہے۔اصول حکمرانی سے لے کر نظام تمدن کی جزئیات تک۔۔۔انسانی اجتماعیت ہمیشہ خلافت راشدہ کی ممنون ومقروض رہے گی۔تاریخی حقائق اور نظائر کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو اپنی دینوی فلاح اور اخروی کامیابی کے لئے جس جامع نظام کی تلاش ہے وہ صرف اور صرف رسول خدا ﷺ کے خلفاء کے قائم کردہ معاشرے سے ہی مل سکتا ہے!!!!

حوالہ جات وحواشی

فصل اوّل:

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور:۱۷۹، ایضاً، عہد نبوی کے میدان جنگ:۷

2. *History of The Arabs* ,p:3

۳،۴۔ بخاری (کتاب الاحکام، باب الاستخلاف):۱۵۱۷

ابن سعد: طبقات :۱۴۱/۳، ابو یوسف، کتاب الخراج:۷۔۸

۵،۶۔مشکوٰۃ: کتاب المناقب، بحوالہ ترمذی، ابن اثیر: الکامل:۳۳/۳، طبقات:۲۴۹/۳،

ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ:۴۶/۱ ، ۷۔طبقات:۲۰/۳، الکامل:۸۰/۳،

طبری:۵۲/۵، المسعودی، مروج الذھب:۴۲/۲

8. *The Caliphate, p:22*

۹۔ مسند احمد: حدیث:۱۳۳، ۱۰۔ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ:۱۸/۱۔۱۹

۱۱۔ ابن خلدون، مقدمہ:۹۱/۱،۳۷۱، ۱۲۔ابن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ:۳۱۱/۴

۱۳۔ امام ابو یوسف، کتاب الخراج:۱۱۷، ۱۴۔ابن جریر الطبری، تاریخ:۴۴۶/۳،

۱۵۔ طبقات:۱۱۳/۴،

۱۶۔امام بخاری: الادب المفرد:۵۳،

۱۷۔ کنز العمال:۳/۱۳۴، ۱۳۹،   ۱۸۔طبری:۳/۱۹۹

۱۹۔ امام ابو یوسف، کتاب الخراج:۲۵،

۲۰۔ بلاذری، فتوح البلدان:۲۷۶،

طبری:۴/۲۵۷، ابن اثیر، الکامل:۳/۷۴۔۷۵، ۲۱۔کنز العمال:۵/ ،

۲۲۔ ابن سعد، طبقات:۳/۲۸،   ابن کثیر:۸/۳،

۲۳۔ احمد بن حنبل، مسند:۱/۶،

۲۴۔ ابن الاثیر، اسد الغابۃ:۴/۷۱ ،۲۵۔کنز العمال: حدیث:۲۳۱۳،

۲۶۔ طبری:۲۷۴۷،

۲۷۔ابن اثیر، الکامل:۲/۴۱۸،

کنز العمال: حدیث: ۳۵۵، ابو یوسف، کتاب الخراج:۶۶۱

۲۸۔ طبری:۲۹۲۸، ابن کثیر:۸/۴،۵،

۲۹۔ بیہقی، السنن الکبریٰ:۱۰/۱۳۶

۳۰۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان :۲/۱۶۸،

31.Aristotle, Politics: III

۳۲۔ الطبری:۳/۵۵۰، کنز العمال:۳/۱۷۴۷

۳۳۔ عبدالرؤف ملک، مغرب کے عظیم فلسفی:۱۷۔۲۰، ۳۴۔کنز العمال:۳/۱۳۹،

۳۵۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان:۲/۱۶۸،

۳۶۔ شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت:۳۔۷۳۔۱۷۲

۳۷،۳۸۔الطبری:۳/۲۷۳،

۳۹۔ سید مودودی، خلافت وملوکیت:۱۰۱۔۱۰۰

۴۰۔ ابو یوسف، کتاب الخراج:۲۱،۲،۷، ۴۱۔الطبری:۳/۲۶۴، ابن سعد:۳/۳۴۴۔۳۴۰،

۴۲۔ الطبری:۳/۲۴۰۴،

۴۳۔ ابن اثیر: الکامل:۳/۳۲، طبقات:۳/۲۴۹،

۴۴۔ الطبری:۲/۲۶۳ ،

۴۵۔ شاہد حسین رزاقی: تاریخ جمہوریت: ۷۲

فصل دوم:

1. Philip K. Hitti,History of the Arabs, p: 142

۲۔ البقرۃ:۳۰، الاسراء:۷۰، الاحزاب:۳۲، الذاریات:۵۶، المومنون:۱۱۱۵۔۱۱۸

۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۳۱۱/۱، ۴۔ الطبری:۲۷۳/۳، ۵، ۶۔ ایضاً:۲۴۰، ۴۴۶

۷۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان:۱۶۸/۲، ۸۔ سید مودودی، خلافت وملوکیت:۱۷۲۔۱۷۳

۹۔ یعقوبی، کتاب البلدان:۱۱۱/۲، طنطاوی، عمر بن خطاب :۱۸۷،

۱۰۔ جصاص، احکام القرآن:۱۶۵/۲

۱۱،۱۲۔ طنطاوی، عمر بن خطاب:۱۸۴،۱۸۵

۱۳۔ ابویوسف، کتاب الخراج :۲۱،۷۲

۱۴۔ عینی: شرح البخاری:۲۷/۱۳،

۱۵۔ الطبری:۳۱۲/۴

۱۶۔ حسن ابراہیم، النظم الاسلامیہ:۶۲۰

۱۷۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ:۳۴۰/۳

۱۸۔ الطبری:۴۵۰/۳

۱۹،۲۰۔ ایضاً:۲۹۲

۲۱۔ ابویوسف، کتاب الخراج:۲۵

۲۲۔ کنز العمال: حدیث نمبر۲۳۱۴،

۲۳،۲۴۔ السرخسی، المبسوط :۱۲۵/۱۰، طنطاوی، عمر بن خطاب:۱۸۴،

۲۵۔ حسین ہیکل، ابوبکر:۸۷

۲۶۔ النساء:۱، الاسراء:۷۰، النحل:۹۷، لقمان:۱۴۔۱۵،

۲۷۔ ابن الاثیر، اسد الغابہ:۴۸۱/۵، ابن حجر العسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ:۲۲۹/۴

۲۸۔ جلال الدین عمری، عورت اسلامی معاشرہ میں:۱۷۹

۲۹،۳۰۔ ابوعبید، کتاب الاموال:۴۴،۲۲۴،

۳۱۔ الماوردی، الاحکام السلطانیۃ :۱۴۳۔۱۴۴ ,۳۲۔ابو عبید، ایضاً:۴۳،
۳۳۔ سید قطب، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام:۲۵۵
۳۴۔ کنز العمال:۲۳۱۳،
۳۵۔ سید مودودی، تفہیم القرآن:۸۹/۵، ۳۶۔الطبری:۵۵۰/۳،
ابن ہشام، السیرۃ النبویہ:۳۱۱/۲، ۳۷، ۳۸۔الطبری:۲۷۳/۳،
۳۹، ۴۰۔ایضاً:۵۵۰/۳، ابن کثیر:۸/ ۴۔۵

باب پنجم

مسلم سیاسی مفکرین اور ریاست کا فلاحی نظام

دور جدید میں ریاست کا تصور ایک ایسی منظم اجتماعیت کا ہے جو اپنے تمام شہریوں کو زندگی کی تمام بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہو۔ ریاست سے یہ توقع کوئی نہیں بلکہ ریاست کی تشکیل اور ارتقاء، اسی تقاضا کی ایک عملی شکل ہے۔ قدیم وجدید سیاسی مفکرین ریاست کو مؤثر، مستحکم اور خوشگوار بنانے کیلیے، اپنا اپنا خاکہ ہمیشہ پیش کرتے رہے ہیں، لیکن عملی میدان میں انسانی رویّوں کے عدم توازن نے اپنے گل کھلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جس سے افراد معاشرہ اور تنظیم ریاست کے درمیان، غلط فہمی، بداعتمادی اور کشمکش کی فضا بھی پیدا ہوتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے سیاسی مفکرین کی ایک جماعت ریاست کو ایک استحصالی ادارہ سمجھتی رہی ہے۔ اسکے مقابلے میں، فلاحی ریاست یعنی Welfare State کا تصور ابھرا جسکے مطابق اس ادارے کو معاشرے کی بھلائی اور خوشحالی کا ذمہ دار مانا گیا ہے۔ جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں تجزیہ نگار لکھتے ہیں:

In the 20th century, concepts of state ranged from anarchism, in which the state was deemed unnecessary and even harmful in that it operated by some form of coercion, to the welfare state, inwhich the government was held to be responsible for the survival of its members, guaranteeing subsistence to those lacking it.

تاہم سیاسی ماہرین نے، یورپ کی کچھ جدید کامیاب ریاستوں کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے، ایک فلاحی ریاست کو شہریوں کی تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنے والی منظم اجتماعیت گردانا ہے:

In its more thoroughgoing form the welfare state provides state aid for the individual in almost all phases of his life — "from the cradle to the grave" —.

ظاہر ہے یہ بات کہنی آسان اور کر کے دکھانی بہت مشکل ہے۔ افلاطون کی یوٹوپیا سے لیکر آج کی فلاحی ریاست تک کے خوابوں کو حقیقت کی شکل دینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ افراد معاشرہ کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر ضروریات زندگی کا تعین اور مطلوبہ مقدار میں فراہمی ایکطرف، معاشرے میں طبقاتی اجارہ داریوں اور حکومتی امور میں نوکر شاہی کے دروازوں سے گذر کر عوام الناس تک وسائل کی رسائی دوسری طرف۔۔۔ ایک عظیم چیلنج کے طور آجکی ریاست کے سامنے موجود ہے۔ بہر حال مغربی جمہوریت کے تحت کام کرنے والی، قدرے تھوڑی آبادی کی حامل ریاستوں میں، اس سلسلہ میں خاصے کامیاب تجربے ہو چکے ہیں۔ وسیع انسانی معاشروں تک فلاحی ریاست کے ثمرات پہنچانا۔۔۔ سرمایہ داری کے عالمی نظام اور قومی تعصبات سے بھری دنیا میں۔۔۔ ناممکن العمل دکھائی دیتا ہے۔

زیر نظر سطور میں ان مسلم مفکرین کے افکار کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے جنہوں نے، قرآن وسنت کی روشنی میں، اسلامی سیاسی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے اپنے دور کے تناظر میں اپنے افکار پیش کیے۔ مسلم سیاسی مفکرین کا پیش کردہ، فلاحی ریاست کا یہ خاکہ، اپنے اندر ایک طرف خلافت کے اصولوں کی جھلک رکھتا ہے اور دوسری طرف نئے سیاسی افکار کے ارتقاء کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

یاد رہے کہ اسلامی فلسفہ سیاست کا اصل ماخذ رسول خدا کا اسوہ کامل اور آپؑ سے براہ راست فیضیاب ہونے والے خلفاء راشدین کا طریق حکومت ہے۔ ثانوی ماخذ کے طور پر ہم دو چیزوں کو سامنے رکھتے ہیں: مسلمان حکمرانوں کے اسلامی اصول اور مسلمان مفکرین کا وہ اجتہاد، جو قرآن وسنت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہو۔

اس مطالعے میں ہم نے اختصار کے پیش نظر، طویل اقتباسات کی بجائے اپنے الفاظ میں مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی ایک موضوع پر، مختلف ماہرین کی ایک جیسی رائے ہونے کیصورت میں، تفصیلات کو دہرانے سے گریز کیا گیا ہے۔ تاہم اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ حکومت وریاست کے تمام قابل ذکر پہلوزیر مطالعہ آجائیں۔

ابونصر فارابی (۸۷۰۔۹۵۰ء)

تیسری صدی ہجری کا یہ مسلم مفکر بنیادی طور پر ارسطو کے شارح اور 'معلم ثانی' کے طور پر جانا جاتا ہے، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کی سیاسی فکر اصلاً اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور غالباً وہ پہلا اسلامی مفکر ہے جس نے ریاست کے جملہ امور سے متعلق اپنے افکار کو منظم طور پر پیش کیا ہے۔ فارابی کی وہ تصانیف جو ان کے سیاسی افکار کو واضح کرتی ہیں، درج ذیل ہیں:

سیاست المدینه۔ جوامع السیاست۔ اجتماع المدینة۔
آراء اهل المدینه الفاضله۔

فارابی کے خیال میں انسان ایک سماجی حیوان نہیں بلکہ عقل فعال رکھنے والا خیر خلائق ہے۔ ریاست وتمدن اس کی ضرورت ہے لہذا وہ ایسی اجتماعیت ترتیب دیتا ہے جو داخلی خطرات اور باہمی تنازعات کے ازالے اور انصاف کی فراہمی کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ اجتماع انسانی، رضا کارانہ بنیادوں پر معرض وجود میں آتا ہے اور اس کے قیام کا مقصد ''حصول سعادت'' ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک معاہدۂ عمرانی (Social Contract) ہے جو پر امن بقائے باہمی کے اصول پر برضاو رغبت، انسانوں نے اپنی ضرورت کی خاطر قائم کیا ہے۔

فارابی نے اپنے اس نقطۂ نظر کو اپنی کتاب 'آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے سولہویں باب: القول فی احتیاج الانسان الی الاجتماع و التعاون کا ابتدائی پیراگراف مذکورہ بالا فکر کی وضاحت پر مشتمل ہے۔(۱)

فارابی نے ایسے پسندیدہ اور مثالی تمدن کو 'المدینة الفاضلة' کا نام دیا ہے، جس کی تعریف وہ یوں کرتا ہے:

فالمدینة التی یقصد بالاجتماع فیها التعاون علی الأشیاء

التی تنال بها السعادة فی الحقیقة۔(۲)

'ایسا اجتماع جو اس مقصد کے تحت قائم ہوتا ہے کہ حقیقی سعادت (حسن وخوبی و خوشحالی) کے حصول کی خاطر ہر طرح تعاون سے رہا جائے'۔

فارابی کے خیال کے مطابق ایسے اجتماع کی مثال انسانی جسم کی ہے جس میں اعضاء کے باہمی ربط وتعاون سے جسمانی وروحانی برکات حاصل ہوتی ہیں۔

و المدینة الفاضلة تشبه البدن التام الصحیح الذي یتعاون أعضاء ه کلها علی تتمیم حیاة الحیوان و علی حفظها علیه۔(۳)

فارابی نے معیاری اور غیر معیاری سلطنت کی تقسیم تقریباً ارسطو کے تصورات کے مطابق کی ہے تاہم اس نے سربراہ مملکت وحکومت کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی ہیں۔ ناپسندیدہ اور غیر معیاری سلطنتوں میں اس نے جبری حکومت (مدینة التغلب) مطلق العنانیت (مدینة الجاهلیة) اور جمہوریت (مدینة الجماعیة) کا ذکر کیا ہے۔ جمہوریت کو اس نے آزاد لوگوں کی خواہشات کے تابع حکومت قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

مدینة الجماعیة هی التی قصد أهلها أن یکونوا أحرارا، یعمل کل واحد منهم ما شاء، لا یمنع هواه فی شئ أصلا۔(۴)

وہ جمہوری معاشروں کی طرح ریاست میں انفرادی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے تاہم اس سلسلہ میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظاموں کی دو انتہاؤں کے درمیان ایک توازن و اعتدال کا قائل ہے۔(۵)

فارابی کے خیال میں سلطنت کا ذمہ دار ایک ہمہ صفت سربراہ ہونا چاہیے جسے اس نے 'رئیس الاول' کا نام دیا ہے جو درج ذیل خصوصیات کا مالک ہو:

تام الاعضاء (اعضاء وحواس میں مکمل) جید الفهم و التصور (فہم وفراست میں طاق) جید الحفظ (حافظے میں تیز) جید الفطنة، ذکیا (ذہین فطین) حسن العبارة (اظہار خیال مؤثر) محبا للتعلیم و الاستفادة (تعلیم وتہذیب کا دلدادہ) غیر شره علی المأکول و المشرب و المنکوح (لہو ولعب اور جنسی ترغیبات سے مجتنب) محبا للصدق (صداقت کا علمبردار) کبیر النفس (وسیع القلب) محبا للعدل (عدل و

انصاگ کا یاور) قوی العزیمة (متحرک ومشاق)۔۔۔۔اس کے خیال میں اگر یہ خواص کسی ایک شخص میں محال ہوں تو ایسی خصوصیات میں سے زیادہ سے زیادہ رکھنے والے کو ترجیح دی جائے اور ایسا نہ ہو تو پھر اس طرح کی صلاحیتوں کے حامل افراد کا ایک ادارہ ہو جو مقتدر اعلیٰ کی راہنمائی کرنے کے لئے موجود ہو۔(٦)

چونکہ ریاست ،بقول فارابی کے، ایک زندہ جسم کی مانندہ ہے لہذا رئیس مملکت کی حیثیت مرکز جسم کی ہے اور اس کی مضبوطی وکمزوری کا دار و مدار رئیس الاول کی قوت و کمزوری پر ہے۔اعضائے ریاست میں سے وہی رئیس بنے گا جو سب میں سے مضبوط و توانا اور متحرک مؤثر ہو گا۔لہذا ایسا ہی ہے فارابی کا 'رئیس الاول'!

وكما ان العضو الرئيسى فى البدن هو بالطبع أكمل أعضاء ه و أتمها فى نفسى و فيما يخصة ...كذلك رئيس المدينة هو أكمل أجزاء المدينة فيما يخصه۔(٧)

ایسے سربراہ مملکت کا تصور تو آسان ہے مگر عملی دنیا میں اس کا پایا جانا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔فارابی کا رئیس الاول،قرآن کے اشارے' بسطة فى العلم و الجسم' سے ماخوذ لگتا ہے یا پھر افلاطون کے فلسفی حکمران سے مماثل ہے۔قرآن نے بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کی یہ خصوصیت بیان کرکے نبی کے ذریعے ایسے سربراہ ریاست کے تصور کی تائید کی ہے۔(٨)

روزنتھال (Roscenthal) نے فارابی کے رئیس اول پر یہ تبصرہ کیا ہے:

Neither the Caliph —— the successor and vice-gerent of the prophetic lawgiver Muhammad (Sallah-o-Alaih-e-Wassalam) ---- simply transformed in to the philosopher- King of the Republic, nor yet the philosopher-King transformed in the Caliph..(9)

بہر حال، فارابی وہ پہلا اور منفرد سیاسی مفکر ہے جس نے ایک مثالی سربراہ مملکت کے خدوخال اور خواص اتنی تفصیل سے بیان کئے ہیں جو بظاہر 'خليفة المسلمين' کے آئیڈیل کو

سامنے رکھ کر ترتیب دیئے گئے ہیں مگر کسی بھی مثالی ریاست کے لیے بنیادی فلسفے کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس میں نظریے میں جدید وقدیم کا حسین امتزاج ہے اور ایسی خصوصیات کا حامل سربراہ مملکت، حسن انتظام اور حفاظت حقوق انسانی کے حوالے سے مستعد اور کامیاب رہے گا۔

فارابی نے انسانوں کے ایسے سماجی معاہدے کو جو" باہمی تعاون برائے حصول سعادت" پر قائم ہو، استحکام ریاست کی بنیاد قرار دیا ہے۔ تقریباً چھ سات صدیاں بعد مغربی سیاسی مفکرین ہابس(۱۵۸۶-۱۶۷۹ء)، لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴ء) اور روسو(۱۷۱۲-۱۷۷۸ء) نے اسی تصور کو عمرانی معاہدے (Social Contract) کا نام دے کر، ریاست کی ابتداء قرار دیا۔ ہابس نے اس معاہدے کی بنیاد، انسان کا ایک دوسرے پر عدم اعتماد اور باہمی حقوق کی اجتماعی حفاظت کو سمجھا، جان لاک نے اسے لوگوں کی خواہش امن وسکون کا نتیجہ قرار دیا اور روسو نے جان و مال اور انفرادی آزادی کی ضمانت گردانا۔۔ تاہم اس خیال کو بنیادی طور پر فارابی نے پیش کیا تھا اور بعد میں آنے والے مفکرین اسی کی خوشہ چینی کرتے رہے۔

الماوردی (۹۷۴-۱۰۵۸ء)

ماوردی کے سیاسی وسماجی افکار کی جامع کتاب 'الاحکام السلطانیة' ہے۔ یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے جسے اسلامی دستور کے ماخذ کے طور پر لکھا گیا۔۔ خلافت، وزارت، ولایت، سپہ سالاری، قضا، معاشی مسائل، ارضیات احتساب۔۔۔۔ شاید ہی کوئی شعبہ سیاست ایسا ہوگا جس پر تفصیلی احکام، اس جامع اور مختصر کتاب میں موجود نہ ہوں!

قرآن وحدیث سے استدلال، صحابہ کے اقوال وافعال سے حجت اور غیر مسلموں کے تاریخی حقائق سے مثالیں لے کر ایک جامع دستاویز مرتب کی گئی ہے جو مثالی اسلامی حکومت کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔

الماوردی کے خیال میں خلافت یا امامت (حکومت) کا قیام، اجتماع انسانی کے لئے ضروری ہے۔ احکام السلطانیہ کے پہلے باب کے ابتدائی الفاظ ہی یہ ہیں کہ:

الامامة موضوعة لخلافة النبوة فی حراسة الدین و سیاسة الدنیا و عقدها لمن یقوم بها فی الأمة واجب بالاجماع۔ (۱۰)

اس قول سے درج ذیل اصول اخذ ہوتے ہیں:

(i) امامت نبی کریم ﷺ کی جانشینی ہے (ii) اس کا قیام دین کی حفاظت اور (iii) دنیاوی معاملات کے انتظام کے لئے ہوتا ہے۔ (iv) امت کے راہنما اس پر متفق ہیں کہ اس کا قیام لازمی ولابدی چیز ہے۔

ماوردی کہتے ہیں کہ خلافت، حفاظت دین اور انتظام دنیا کے مقاصد کے ساتھ، ظلم کے استیصال، مقدمات ومسائل کے فیصلے اور عدل وانصاف کے نفاذ کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے:

یمنعهم من التظالم ، و یفصل بینهم فی التنازع و التخاصم ...
العدل فی التغاصف و التواصل۔(۱۱)

امت کی سربراہی اور امامت کی اہلیت کے لئے، ماوردی نے سات شرائط کو لازمی قرار دیا ہے:

العدالة.. الاجتهاد.. سلامة الحواس.. سلامة الأعضاء...
تدبیر المصالح... الشجاعة ... النسب (من قریش)۔(۱۲)

(عدل۔علم۔صحت حواس۔صحت اعضاء۔تدبر وفراست۔شجاعت۔قریشی نسب)

ان کے خیال میں امام کا تقرر، دو طریقوں سے ہوتا ہے:

باختیار أهل العقد و الحل (ذمہ داران قوم کے مشورے اور مرضی سے) یا
بـعهد الامام من قبل (ولی عہد کی نامزدگی من جانب امام) ان دو طریقوں میں سے، ماوردی نے پہلے طریقے کی حمایت وتائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فقالت طائفة لا تنعقد الا بجمهور أهل العقد و الحل من کل بلد
لیکون الرضاء به عاما و التسلیم الا مامة اجماعا۔(۱۳)

گویا ماوردی خلافت کے انعقاد کا بہترین ذریعہ، اہل الرائے افراد کی اکثریت کی طرف سے انتخاب کو قرار دیتے ہیں مگر ہر فرد کو رائے دینے کا اختیار نہیں دیتے۔ ان کے خیال میں، سربراہ مملکت کا انتخاب ایک انتخابی ادارہ (Electoral College) کی بنیاد پر ہونا چاہیے جس میں ہر شہر کے ذمہ داران کی اکثریت، برضا ورغبت شرکت کرے۔ اس انتخاب کی تائید میں عوام الناس کی طرف سے ''بیعت'' عام کو، وہ لازم قرار دیتے ہیں۔ انکے خیال میں جو لوگ اس

طرح سے منتخب کئے گئے امام کی بیعت کریں، ان پر اس شخص کی اطاعت ضروری ہو جاتی ہے۔

فلزم کافة الامة الدخول فی بیعته و الانقیاد لطاعته۔(۱۴)

ماوردی نے امام کے دس فرائض بیان کیے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

حفظ الدین، قطع الخصام بین المتنازعین، حمایت البیضة، اقامة الحدود، تحصین الثغور، جهاد من عاند الاسلام، جبایة الفئ و الصدقات، تقدیر العطایا، استکفاء الافتا، تصفح الأحوال۔(۱۵)

(دین کی حفاظت۔عدل وانصاف۔امن وامان۔تحفظ سلطنت۔محصولات کا نظام۔مستحقین کے وظائف۔قابل عمال حکومت کا تقرر۔امور سلطنت پر کڑی نگرانی۔۔جہاد، حدود و تعزیرات کا نفاذ۔)

احکام السلطانیہ، چونکہ ایک جامع دستور مملکت ہے اس لیے اس میں سیاسی حاکمیت کے تمام تر شعبہ جات کی تفصیل موجود ہے۔امام کے جن فرائض کا ذکر ماوردی نے کیا ہے، ان سے متعلق حکومتی محکموں کی تفصیل، ان کے دائرہ کار کا تعین اور فرائض کی ترتیب سے بھی آگاہ کیا ہے۔وزارتوں اور قضاۃ کے بیان میں ان کی اہلیت وتقرر کی شرائط تک بتادی ہیں (۱۶) محکموں کی تقسیم، دفاع، خزانہ، سرحدات، عمال کی تقرری ومعزولی اور دیگر اصولی تفاصیل دی گئی ہیں۔ماوردی نے حکومتی محکموں میں سب سے زیادہ زور 'محکمہ احتساب' پر دیا ہے۔وہ اسے دینی اصولوں میں ایک اہم مقام دیتے ہیں:

والحسبة من قواعد الأمور الدینیة۔(۱۷)

انہوں نے احتساب کی تعریف، محتسب کی شرائط اہلیت اور محکمہ احتساب کی ذمہ داریوں کے ساتھ اس کے طریق کار سے بھی بحث کی ہے۔۔احتساب سے کیا مراد ہے؟ ماوردی کے خیال میں:

هي أمر بالمعروف اذا ظهر ترکه و نهي عن المنکر اذا ظهر فعله۔(۱۸)

محکمہ احتساب کا کام معاشرتی وسماجی معاملات کا جائزہ اوران کی تعمیر واصلاح ہے۔لہذا اس اہم اور نازک کام کے لیے ایسے افراد کا تقرر کیا جائے جو اس کے شایان شان ہوں۔وہ

آزاد عادل اور مجتہد ہوں تاکہ فہم فراست کے ساتھ بے لاگ انصاف کی ترویج کا باعث بن سکیں:

فمن شروط ولي الحسبة أن يكون حرا، عدلا، ذا رأي و صرامة و خشونة فی الدين وعلم بالنكرات الظاهرة۔(۱۹)

ایسے محتسب کی زیر نگرانی قائم ہونے والے محکمۂ احتساب کے اصول وفرائض درج ذیل ہیں:

۱۔احتساب، محکمہ قضا اور محکمہ مظالم کے درمیان کا محکمہ ہے جو حقوق انسانی کے سلسلہ میں درج ذیل امور سرانجام دے۔

(i) ناپ تول میں کمی، چیزوں میں ملاوٹ یا کھوٹ اور قیمتوں کا اتار چڑھاؤ، واجب الاداء قرضوں میں ٹال مٹول یا حقوق کی ادائیگی میں لیت ولعل وغیرہ کا جائزہ اور ازالہ۔

(ii) قضاۃ کے علم میں نہ آنے والے مقدمات کے فیصلے یا ایسے مقدمات جن کا کوئی مدعی نہ ہو ان کی چارہ گری کرنا اور خود تلاش وجستجو کے بعد بدی کو مٹانے کے لیے سلطنت کی طاقت کا استعمال۔

(iii) ایسے معاملات نمٹانا جن کے ازالے میں قضاۃ بے بس ہوں یا حکومت کی طرف سے انہیں روک دیا گیا یعنی وہ ان کے دائرہ کار سے باہر پڑتے ہوں۔

۲۔امر بالمعروف:

حقوق اللہ، حقوق العباد اور ان میں مشترکہ حقوق کی ادائیگی کروانا یعنی

(i) عبادات وفرائض (ii) رفاہ عامہ اور (iii) معاشرتی وسماجی فرائض کی بجا آوری پر شہریوں کو لگانا۔

۳۔نہی عن المنکر:

(i) حقوق اللہ، حقوق العباد اور مشترکہ حقوق کے سلسلہ میں منکرات کا استیصال۔

(ii) مختلف پیشہ وشعبہ ہائے زندگی کا جائزہ اور ان میں سے قوم کی جان ومال اور صحت کے لئے ضرر رساں پیشوں اور پیشہ وروں کا احتساب وغیرہ۔(۲۰)

گویا الماوردی کا پیش کردہ حقوق انسانی کا محافظ یہ ادارہ ایک طرف تو اسلامی تعلیمات کے اس حصے کی منظم شکل ہے جو تعمیر واصلاح انسانیت سے متعلق ہیں اور دوسری طرف

افراد معاشرہ کی معاشی اور سماجی زندگی کے حسن انتظام کا ضامن ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور مسلمان مفکرین کا حقوق انسانی اور امور مملکت کے حسن انتظام سے متعلق شعور، کتنا گہرا اور وسیع تھا۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اہل اسلام اپنے دین کی فراہم کردہ اصولوں کی بنیاد پر انسانی آبادیوں کو تہذیب وتمدن کے نئے زاویوں سے روشناس کرواتے رہے۔

نظام الملک طوسی (۱۰۱۷۔۱۰۹۱ء)

سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان (۱۰۶۳۔۱۰۷۲ء) اور ملک شاہ (۱۰۷۲۔۱۰۹۲ء) کے ساتھ وزیر اعظم کے طور پر رہنے والے مسلمانوں کے بطل جلیل طوسی کے سیاسی افکار ان کی کتابوں 'سیر الملوك' اور 'سیاست نامه' اور 'مجمع الوصایا (دستور الوزراء)' سے ماخوذ ہیں۔

طوسی کے مطابق اللہ تعالیٰ، ہر زمانے میں اپنے بندوں میں سے ایسے اشخاص کو سربراہی اور ملک کے نظم ونسق کے لئے منتخب کر لیتا ہے جو اس کام کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں ان کا رعب اللہ کی طرف سے ڈال دیا جاتا ہے اور یوں وہ امامت وسربراہی پر فائز ہو جاتے ہیں۔(۲۱)

گویا طوسی، بادشاہ کو مامور من اللہ سمجھتا ہے اور اس کی اطاعت اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ خدائے ذوالجلال اور اس کے رسول ﷺ کے تابع ہوتا ہے اور قرآن کریم کی ہدایت ﴿ أطيعوا الله و أطيعوا الرسول و أولى الأمر منكم ﴾ کے مطابق، عوام الناس کے لیے، بادشاہ کی اطاعت فرض ہے۔

پادشاہاں را نگاہ داشتن رضا اوست تعالیٰ شانہ ورضای حق عز اسمہ اندر احسان بود کہ با خلق کردہ شود۔(۲۲)

اس کے خیال میں رعایا کے اعمال اچھے ہوں تو ان پر اچھا حکمران، اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ اگر ظالم عوام ہوں گے تو ظالم بادشاہ مسلط ہوگا۔

بادی النظر میں اس کے تصور مقتدر اعلیٰ سے مطلق العنانیت کا تصور ابھرتا ہے، مگر جب

وہ بادشاہ کی ذمہ داریاں اور فرائض بیان کرتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایسی پابندیوں میں بادشاہ قطعاً مطلق العنان نہیں بن سکتا بلکہ وہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے۔

اس کے خیال میں شرعی احکام کی عملداری اور قیام عدل، سربراہ حکومت کے لازمی اور مقدم فرائض ہیں۔اس کے لئے مشاورت بھی ضروری ہے۔(۲۳) اور خداخوفی کے ساتھ قابل ،عمال کا تقرر کرنا بھی اس کے بنیادی فرائض کا حصہ ہے۔ فارابی اور ماوردی کے بیان کردہ اوصاف امامت کے ساتھ ساتھ طوسی یہ بھی سمجھتا ہے کہ بادشاہ میں علوم وفنون کا ذوق بھی موجود ہونا چاہیے۔(۲۴)

طوسی ،نظام مملکت کے مختلف حصوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے جس میں دربار، قضا، مال، دفاع، سفارت اور جاسوسی کے محکمے شامل ہیں۔اس کے خیال میں دربار غریب پرور ہو، محکمہ قضا شرعی احکام کا سختی سے پابند، اور محکمہ مال، شرعی محاصل کے علاوہ دیگر ٹیکس لگانے کی کوشش نہ کرے اور محصولات کی وصولی میں لوگوں کی مالی حیثیت کا خیال ضرور رکھے۔ محکمہ دفاع کے حوالے سے اس کی تجویز یہ ہے کہ ہر علاقے اور نسل کے لوگ فوج میں شامل کئے جانے چاہئیں۔اس سے سیاسی وحدانیت اور سماجی ہم آہنگی کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔(۲۵)

بین الممالک تعلقات اور خارجہ پالیسی کے حوالے سے نظام سفارت کاری پر طوسی کی سوچ، اپنے دور سے کہیں آگے معلوم ہوتی ہے۔۔۔وہ سفیر کا کام صرف پیغام رسانی نہیں سمجھتا بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ سفیر جس ملک میں بھیجا جائے وہ اس ملک کے جغرافیائی ، سیاسی، تمدنی اور ثقافتی حالات سے پوری آگاہی رکھتا ہو۔وہ نظام حکومت اور معاشی مسائل سے شناسائی رکھتا ہو۔حتیٰ کہ وہ ایسی تمام معلومات رکھتا ہو جو کل کو اس ملک میں حملہ کرنے کی صورت میں ضروری ہوں (۲۶) بہتر فرمانروائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ بادشاہ کو حکام اور رعایا کے بارے میں سرکاری رپورٹوں کے علاوہ بھی معلومات ایسے طریقے سے پہنچتی رہیں کہ مملکت کے معاملات اس کے سامنے واضح ہوں۔اس کے لئے طوسی نے جاسوسی کے محکمہ کو فعال اور ہمہ گیر بنانے کے لئے تجاویز دی ہیں۔ اس کے خیال میں کامیاب ترین حکمران وہ ہے جسے مملکت کے دور دراز علاقوں سے معمولی سے معمولی بات بھی بہم پہنچتی رہے۔طوسی ہر محکمہ میں، ہر علاقے میں، مختلف بھیسوں میں، جاسوسوں کے تقرر کی سفارش کرتا ہے۔(۲۷)

جہاں تک عورتوں کے سیاست و ریاست کے معاملات میں دخل کا تعلق ہے، طوسی اس کے حق میں نہیں ہے۔ اس کے خیال میں یہ جنس نازک، سیاست و حاکمیت کی مشکلات کو سمجھنے سے قاصر ہے، اس کے خیال میں جب بھی عورتوں کا دخل حکمرانوں کے معاملات میں بڑھ جائے گا اس ریاست کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

طوسی کا یہ نقطۂ نظر دراصل اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور اس نے اپنی رائے کی بنیاد اور پس منظر کے طور پر قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام سے حوالے اور مثالیں پیش کی ہیں۔ (۲۸)

طوسی نے بادشاہ کے فرائض واختیارات میں حصہ بٹانے اور نظام حکومت کو بہتر انداز میں چلانے کے لئے وزارتوں کے قیام، وزیروں کے اوصاف وفرائض اور ان کے اختیارات کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس نے وزراء کی ذمہ داریوں میں سرفہرست دین کی حفاظت اور عوام کی فلاح و بہبود کو قرار دیا ہے۔ وزیروں کے اوصاف میں اس نے عقل وفہم، بلند کرداری، خلوص و صداقت، اور تاریخ عالم سے آگاہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ بادشاہ کے وزیروں سے مشورہ کرنے پر اور وزیروں کے بادشاہ کے ساتھ قریبی رابطے پر زور دیتا ہے۔ نظام مملکت کو مثالی انداز میں چلانے کے لئے اس نے وزارتی نظام کو اتنی اہمیت دی ہے کہ نصیحۃ الملوک کے ساتھ ساتھ دستور الوزراء بھی لکھی جس میں مذکورہ بالا اجمال کی تفصیل موجود ہے۔ (۲۹)

امام غزالی (۱۰۵۸۔۱۱۱۱ء)

عالم اسلام کے عظیم مفکر، محدث، مفسر، متکلم اور فقیہ امام غزالی کی وہ تصانیف جن میں ان کے سیاسی افکار ملتے ہیں، درج ذیل ہیں:

احیاء علوم الدین، نصیحۃ الملوک، الاقتصاد فی الاعتقاد

غزالی مسلمانوں میں سب سے پہلے مفکر ہیں جنہوں نے علم سیاسیات کی نوعیت، مقاصد اور صفات سے بحث کی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق سیاسیات ایک دینی علم ہے اور اسلام میں سیاست کے اصول، الٰہی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ (۳۰)

غزالی نے غذا، لباس، مکان اور باہمی تعلق ومعاملہ کو انسانی بنیادی ضروریات کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان کے خیال میں روٹی، کپڑا اور مکان کے لئے بالترتیب زراعت، صنعت اور عمارت گری کے علوم درکار ہیں جب کہ انسانوں کے باہمی تعلق اور معاملہ کا منبع علم سیاسیات ہے

اور یہ زندگی کا اہم ترین پہلو ہے۔(۳۱)

اجتماع وتمدن، انسانی فطرت کا تقاضا ہے، سیاست اس اجتماع انسانی کو سنوارنے کا نام ہے۔ انسانی اجتماعیت کے اس سب سے اہم کام کے امام غزالی نے چار مراتب بیان کئے۔ ان کے خیال میں اولین درجے کی سیاست انبیاء کی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت وراہنمائی سے براہِ راست فیضیاب ہوتے ہیں۔ دوسرے درجے کی سیاست خلفاء ملوک کی ہوتی ہے جو انبیاء کے سیاسی جانشین اور لوگوں میں سے بہترین اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد درجہ، علماء کی سیاست کا ہے جو انبیاء کے وارث ہیں، آخری درجہ معلمین اخلاق یا واعظین کی سیاست کا ہے۔(۳۲)

امام غزالی کے خیال میں اجتماع انسانی کو تنازعات سے بچانے اور خون خرابے سے محفوظ رکھنے کے لئے امامت ضروری ہے:

لاینکر وجوب نصب الامام لما فیه من الفوائد و دفع المضار فی الدنیا۔(۳۳)

(امامت کے وجوب سے انکار اس کے فوائد اور دنیا کے مسائل کے حل کے حوالے سے، ممکن نہیں)

لہٰذا امت میں مرکزیت او ہم آہنگی کی خاطر اور معاملات دنیا کو بہتر طور پر منظم کرنے کے لئے امامت کا قیام لازم ہے۔۔۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ امامت (خلافت) کے وجوب پر امت کا اجماع ہے، مگر اجماع کافی نہیں، یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے کہ امامت کے بغیر دین ودنیا کے معاملات ابتری سے دوچار رہتے ہیں:

ان نظام الدین لا یحصل الا بنظام الدنیا و نظام الدنیا لا یحصل الا بامام مطاع۔(۳۴)

غزالی کے افکار سے شخصی حکومت کا تاثر ابھرتا ہے مگر خلیفہ کے فرائض بیان کر کے غزالی نے اس کے اختیارات پر قدغن لگا دی ہے۔ آپ نے امام کے اوصاف وفرائض تفصیل سے بیان کئے ہیں جو بہت حد تک الماوردی کے بیان کردہ فرائض امامت سے ملتے جلتے ہیں۔ امام غزالی، سلطان کے فرائض میں عدل وانصاف کو اولیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں امام کو اپنے آپ کو

خدمت خلق میں لگائے رکھنا چاہیے۔ سادگی، نرمی اور دینداری اس کی شخصیت کا حصہ ہو، وہ تکبر، غصہ اور ظلم سے مکمل پرہیز کرے کہ ان خصوصیات کے بغیر حکمرانی اور جہانبانی ممکن نہیں:

وسلطان بحقیقت آنست کہ عدل کند میان بندگان وی جور و فساد نکند کہ سلطان جائر شوم بود و بقا بنودش زیرا کہ پیغمبر فرمود الملك يبقى مع الكفر و لا يبقى مع الظلم۔(۳۵)

غزالی نے سلطان کے ساتھ وزراء کی ایک کابینہ کی سفارش کی ہے جو سلطنت کے بھاری بھرکم فرائض کی ادائیگی میں بادشاہ کی معاونت کرے۔ امام کے لئے ضروری ہے کہ مختلف شعبہ جات حکومت کو چلانے کے لئے مخصوص صلاحیتیں رکھنے والے وزیروں کا تقرر کرے۔ وزراء اور عمال کو سرکردہ لوگوں سے مشورہ کے ذریعے حکومتی ذمہ داریاں سرانجام دینی چاہییں تاکہ خدمت خلق کا فریضہ بطریق احسن ادا ہو، عدل کے ساتھ رعایا کی خبر گیری اور ستم رسیدہ لوگوں کی مشکلات کا ازالہ کر کے یہ حکام 'اولی الامر' کے مثالی مرتبے پر فائز ہو سکتے ہیں۔(۳۶)

اسلامی مفکرین میں غزالی کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے معاشی نظام کے خدوخال کامرس اینڈ ٹریڈ کے اصول اور سلطنت کے میزانیہ (بجٹ) کا خاکہ پیش کیا ہے۔(۳۷)

انہوں نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین کی جلد دوم کے تیسرے اور چوتھے باب میں حلال وحرام کی تمیز کی روشنی میں کسب رزق اور دیگر معاشی مسائل کا مفصل ذکر کیا ہے۔ حکومت کی آمدن وخرچ کے اصول بھی وضع کئے ہیں اور ناجائز اور مشکوک ومشتبہ آمدنی سے پرہیز کی سختی سے تاکید کی ہے۔(۳۸)

ان اعتبارات سے دیکھا جائے تو امام غزالی کے سیاسی افکار ایک ہمہ جہت تازگی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگی کا عنصر نمایاں ہے۔ انہوں نے آج کے مسائل پر، آج سے ایک ہزار سال پہلے بحث کی ہے جو ان کی سیاسی وسماجی بصیرت کی دلیل ہے۔ امام غزالی کے ہاں بعض اوقات سلطان اور امام (یا خلیفہ) کے الفاظ خلط ملط ہوتے نظر آتے ہیں تاہم لگتا یوں ہے کہ سلطان کا لفظ 'الامام بالفعل یا بالقوۃ' کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں، یعنی امام یا خلیفہ کی موجودگی اور اس کی رسمی سربراہی میں سلطنت کے سارے امور سرانجام دینے والا فرد سلطان کہلائے گا جس طرح کہ روزنتھال لکھتا ہے:

The sultan is the man in control of affairs who owns allegiance to the Imam and grants him prerogatives, that is, he mentions the caliphs name in the address to the public during Friday prayer and mints coins bearing the name of the reigning caliph. His orders and judgments are valid wherever he holds sway.(39)

امام غزالی نے الماوردی کی طرح محکمہ احتساب پر بہت زور دیا ہے۔اس کے طریق کار اور آداب وشرائط کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے احیاء علوم الدین جلد دوم کا نواں باب مختص کیا ہے، جس کا عنوان 'کتاب الامر بالمعروف و النھی عن المنکر' ہے۔

سیاسیات میں آپ نے انبیاء کے درجہ کو سرفہرست قرار دیا ہے۔جب کہ انبیاء کا مقصد بعثت ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا۔آپ کے خیال میں اگر اس فریضہ کی ادائیگی ،کوئی ریاست یا اجتماع انسانی چھوڑ دے تو انسان اور اس کے معاملات دین و دنیا برباد ہو جائیں گے۔ آپ فرماتے ہیں:

ولو طوی بساطة و أهمل علمه و عمله تعطلت النبوة و أضمحلت الديانة و عمت الفترة و خشت الضلالة و شاعت الجهالة و استرى الفساد و اتسع الخرق و خربت البلاد، و هلك العباد۔(۴۰)

(اگر اس کام کی بساط لپیٹ دی جائے اور اس کے علم اور عمل کو مہمل چھوڑ دیں تو نبوت بیکار اور دیانت مضمحل ہو جائے گی، سستی عام اور گمراہی تام ہو جائے گی۔جہالت پھیلے گی اور فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا، جس سے معاشرہ تباہ اور انسان ہلاک ہو جائیں گے۔)

گویا انسانی تعمیر و اصلاح کا صرف ایک یہی راستہ ہے اس کے بغیر تعمیر زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور فساد زندگی سے بچا ہی نہیں جا سکتا۔۔۔۔یہ دنیا کا سب سے اہم اور نازک کام ہے، لہذا اس کے لئے مخصوص آداب و شرائط ہیں جن کے چار پہلو ہیں: محتسب، محتسب علیہ، محتسب بہ اور احتساب۔(۴۱)

امام غزالی نے مذکورہ بالا (نویں باب) میں انہیں چار پہلوؤں سے احتساب کی شرائط اور طریق کار بتایا ہے۔ ان کے بقول احتساب اگرچہ اسلامی حکومت کا فرض ہے مگر مسلمان حکومت اس سے غفلت برتے تو اسلامی ریاست میں ہر مسلمان یہ کام کرسکتا ہے اور اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے مگر اس وقت، جب تمام شرائط و آداب پورے ہوں۔ وہ احتساب کے پانچ مراتب کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔التعریف (بدی کا شعور) ۲۔الوعظ بالکلام الطیب (نرم الفاظ سے نصیحت) ۳۔السب و التعنیف (برا بھلا کہنا) ۴۔ المنع بالقهر (زبردستی منع کرنا) ۵۔التخویف و التهدید بالضرب (قوت کا استعمال)۔۔(۴۲)

ان آداب کے ساتھ اسلامی معاشرے کے افراد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بھی عمال و حکام کا احتساب کرتے رہیں تاکہ معاشرہ اور حکومت کی اصلاح و تعمیر، متواتر جاری رہے۔(۴۳)

ابن تیمیہ (۱۲۶۳۔۱۳۲۸ء)

احمد تقی الدین ابن تیمیہ کا زمانہ مسلمان ریاستوں میں افراتفری کا دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ریاست و معاشرہ کے آغاز کے بارے میں نظریات پیش کرنے کی بجائے اپنی توجہ اپنے زمانے کے موجودہ حالات پر مرکوز کی۔ اس وقت کی ضرورت کے مطابق آپ نے قرآن وسنت کی سیاسی وسماجی تعلیمات کی تشریح پر زور دیا۔ آپ نے احکام شرعیہ کی وضاحت اس طور کی کہ معاشرہ کی تطہیر ہو سکے اور سیاست وقت کو راہنما اصول میسر آسکیں۔ آپ کے سیاسی افکار زیادہ تر درج ذیل تصانیف میں موجود ہیں: السیاسة الشرعیة، منهاج السنة، الامامة و السیاسة۔

ابن تیمیہ انسانی مساوات کے علمبردار ہیں۔ بطور انسان، سب افراد معاشرہ یکساں حقوق رکھتے ہیں اور ان کا مرتبہ یکساں ہے۔ البتہ صلاحیتوں کے لحاظ سے اور دین میں بصیرت کے حوالے سے ان کے درجے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے بقول معاشرے میں ان کے عملی رویے کو سامنے رکھ کر انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ الملوك و الرؤساء (یریدون العلو علی الناس، و الفساد فی الارض)

یعنی غلبے کے خواہاں۔ ملوک ورؤساء

۲۔السراق المجرمین (یریدون الفساد)

یعنی فساد کے خواہاں۔ جرائم پیش افراد

۳۔اھل الدین (عندھم دین) (یریدون العلو بلا فساد)

یعنی اہل مذہب۔۔۔ برتری کے خواہاں

۴۔أھل الجنة (لا یریدون علوا فی الارض و لا فسادا)۔(۴۴)

یعنی افضل وبرتر۔۔۔ نہ فساد کے موجب اور نہ برتری کے خواہاں۔۔۔ سراپا خیر!

گویا ابن تیمیہ نے عاجزی وانکساری سے مزین نیکوکار سادہ شہریوں کو مملکت کے مثالی اور قابل تقلید شہری قرار دیا ہے۔ آپ کے خیال میں انسانی معاشرے کی تعمیر واصلاح صرف احکام شرعیہ کی تنفیذ کے ذریعے ممکن ہے۔ اجتماعی معاملات کی تنظیم کاری سیاست کہلاتی ہے۔ اور یہ اقامت دین اور قربت الٰہی کے لئے ضروری ہے۔ ان کے خیال میں سیاست، تعمیر دنیا ہے، جس کے بغیر دین کا استحکام ممکن نہیں۔ اس لئے دین وسیاست میں تقسیم معاشرے لئے فائدہ مند نہیں۔ اگر ان دونوں کو الگ کر دیا جائے تو اسلامی معاشرے میں دو گروہ معرض وجود میں آ جاتے ہیں۔ ایک دیندار طبقہ جو مال اور قوت حربی سے محروم ہوتا ہے جبکہ ان چیزوں کی دین کو سخت ضرورت ہے۔ دوسرا حاکم وغالب گروہ جو مال اور جنگی قوت رکھتا ہے مگر مقاصد دین اور دینی شعور سے عاری ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں، فریضہ اقامت دین سے محروم رہ جاتے ہیں۔(۴۵)

اس لئے اسلامی معاشرے کی ہم آہنگی اور دین و دنیا کا استحکام اسی بات میں مضمر ہے کہ سیاست کو دین سے الگ نہ ہونے دیا جائے۔

ابن تیمیہ نے السیاسۃ الشرعیۃ میں بیان کیا ہے کہ معاشرتی تنظیم و اجتماع کی عدم موجودگی میں انسانی حاجات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ ایسی منظم اجتماعیت جب عمل میں آ جاتی ہے تو اسے کسی مضبوط سربراہی کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے تا کہ دنیاوی فلاح اور دینی استحکام کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ لہٰذا ابن تیمیہ نے امامت کے قیام کو امت کے لئے لازم قرار دیا ہے:

یجب أن یعرف أن ولایة أمر الناس من أعظم واجبات الدین، بل قیام للدین الا بھا...(۴۶)

اجتماع میں نظم وضبط، خیر وصلاح، عدل و انصاف اور عبادات کی منظم ادائیگی اسی صورت میں ممکن ہے جب امت ایک امام کے تحت ریاست منظم کرے۔ اسی لئے یہ دین کا لازمی حصہ ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرض کو پورا کرنے کے لئے تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں:

ولأن الله تعالیٰ أوجب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر و لا یتم ذلك الا بقوۃ و امارۃ و لذلك سائر ما أوجبه من الجهاد و العدل و اقامة الحج و الأعیاد و نصر المظلوم و اقامة الحدود لا تتم الا بالقوۃ و الامارۃ۔ (۴۷)

(چونکہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف و النهی عن المنکر واجب کیا ہے جو کہ قوت وامارت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا اور اسی طرح سارے واجبات جن میں جہاد، عدل، قیام حج، مظلوموں کی مدد، حدود وتعزیرات کا نظام۔۔۔سب کچھ قوت وامارت کے بغیر ممکن نہیں!)

گویا ابن تیمیہ نے امت مسلمہ کی ضرورت، ایک صاحب قوت وامارت خلیفہ قرار دیا ہے جو تمام تر دینی واجبات کو بطریق احسن ادا کر سکے۔ آپ نے 'منہاج السنۃ' میں خلیفہ کے بارے میں اہل سنت کے نقطۂ نظر کی تفصیل سے وضاحت کی ہے جس میں آپ نے خلفائے راشدین کے عہد کو مسلمانوں کا مثالی عہد حکومت قرار دیا ہے اور آنے والے وقتوں کے لئے مسلمان حکمرانوں کو انہیں جیسا بننے کی تلقین کی ہے۔۔(۴۸)

ابن تیمیہ نے امام کے انتخاب کا طریق کار یا خلیفہ کے اوصاف کی کوئی فہرست نہیں پیش کی ہے، تاہم وہ خلفائے راشدین کو سامنے رکھ کر امامت کے فرائض کی تفصیل ضرور بیان کرتے ہیں جو بنیادی طور پر حفاظت دین اور خدمت خلق کا مرقع ہیں۔

ان کے خیال میں امام کا انتخاب خواہ کیسے ہو وہ بنیادی صفات اور زریں اصولوں سے مزین ہونا چاہیے۔ آپ کے خیال میں امام کا تقرر، خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کی اطاعت ''اولی الامر'' کے ضمن میں آتی ہے۔ آپ نے اس کے فرائض بیان کر کے اس کے مطلق العنان ہونے کے خدشات کا ازالہ کر دیا ہے۔ آپ نے اختیارات حکومت کو امام کے لئے اللہ تعالیٰ کی امانت قرار دیا ہے۔ امانت دو پہلوؤں سے امام پر واجب الادا ہوتی ہے:

امانت فی الولایت اور امانت فی المال۔(۴۹)

یعنی اہل افراد کے ہاتھ میں باگ ڈور دینا اور لوگوں کے مالی ومعاشی امور عدل سے سر انجام دینا۔۔۔ان حوالوں سے امانات کی ادائیگی میں کوتاہی حاکم وقت کی طرف سے امانت میں خیانت کے برابر سمجھی جائے گی۔لھذا عمال اور عہدیداران کے تقرر اور حقوق العباد کی ادائیگی کے حوالے سے،عدل وہ پہلا تقاضا ہے جو امام پر عائد ہوتا ہے۔

ابن تیمیہ نے عمال کے تقرر میں،امام کو افراد کی اہلیت پرکھنے کی تاکید کی ہے اور ایسے لوگوں کو عہدے نہ دینے کی سفارش کی ہے جو عہدوں کی خواہش وجستجو رکھتے ہوں اور ایسے افراد کو محروم نہ رکھے جو مستحق ہوں۔(۵۰)

راعی اور رعایا کے باہمی تعلق و رابطے کی تفصیل میں آپ نے لکھا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مالی حقوق باقاعدگی سے ادا کریں،راعی بے لوث خیر خواہی کریں،بیت المال کی حفاظت کریں انہیں یہ اختیار نہیں کہ عوام کا مال اپنی مرضی سے خرچ کریں۔عمال رعایا کی طرف سے تحفے،نذرانے اور رشوت وصول کرنے یا غیر ضروری سفارشات قبول کرنے کو بھی آپ نے سختی سے منع کیا ہے۔محتاج اور مستحق رعایا کی مدد،تالیف قلب،عطا و بخشش کا سلسلہ حکمرانوں کو مسلسل جاری رکھنا چاہیے۔آپ نے ایسے حکام کی سختی سے مذمت کی ہے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے دست بردار ہو جائیں:

و ولي الأمراذ ترك انكار المنكرات و اقامة الحدود عليها بماله يأخذ كان بمنزلة مقدم الحرامية۔۔۔(۵۱)

آپ فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی وہ کام ہے جس کی بدولت معاشروں اور انسانوں کی خیر وفلاح ممکن ہے۔اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے وابستگی اور اطاعت کے بغیر دنیوی اور اخروی بھلائی ناممکن ہے۔یہ اطاعت و وابستگی بغیر اس فریضے کی ادائیگی کے محال ہے:

یوضح ذلك أن صلاح العباد، بالأمر بالمعروف و النهی عن المنكر ، فان صلاح المعاش و العباد، فی طاعة الله و رسوله، ، لا یتم ذلك الا بالامر بالمعروف و النهی عن المنكر۔(۵۲)

ابن تیمیہ نے نظام شوریٰ پر بہت زور دیا ہے۔قرآن وسنت کے حوالوں سے انہوں نے اس کی اہمیت اجاگر کی ہے اور امام کے لئے شوریٰ کو لازم قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

لا غنى لولي الأمر عن المشاورة

اس باب میں آپ نے مشاورت کے طریق کار اور آداب سے بھی آگاہ کیا ہے۔آپ کے بقول اگر امام مشاورت کا اہتمام کرے تو مشیران کھل کر پرخلوص رائے دیں۔اختلاف رائے کی صورت میں ہر ایک اپنی رائے پر نظر ثانی کرے اور اسے قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھا جائے، جو رائے قرآن وسنت کے اصولوں کے قریب تر ہو اس کو قبول کیا جائے۔شوریٰ میں امام کو جب قرآن وسنت رسول ﷺ کی روشنی میں اجماع مسلمین سے آگاہ کیا جائے تو اس کے لئے لازم ہے ان امور کو بجالائے اور اگر وہ خلاف ورزی کرے تو عوام پر اس کی اطاعت واجب نہیں:

فعليه اتباع ذلك، و لا طاعة لأحد فى خلاف ذلك۔(۵۳)

ابن خلدون (۱۳۳۲۔۱۴۰۶ء)

علم عمرانیات کے بانی مفکر علامہ ابن خلدون نے اجتماع انسانی کو فطرت انسان کا تقاضا قرار دیا ہے۔انہوں نے اس کے لئے لفظ 'مجتمع' استعمال کیا ہے۔ان کے خیال میں اجتماع کے بغیر انسان کا وجود نامکمل ہے۔ایک فرد کی زندگی دیگر کے اوپر کئی حوالوں سے منحصر ہوتی ہے۔ا س ضرورت کے تحت مل جل کر رہنے سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔اس کے اندر باہمی حقوق کی ادائیگی اور ظلم کا تدارک ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو ریاست کی تنظیم پر مجبور کردیتی ہیں، اس طرح تاریخ میں ریاست کا ارتقاء ہوا۔(۵۴)

تمام انسانی قبیلوں میں دوسروں پر غلبہ پانے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ابن خلدون نے اسے 'عصبیت' کا نام دیا ہے۔اس کا بنیادی محرک دفاع ہے۔یہ عصبیت نسب ورشتہ اور مذہبی جوش کے ساتھ بہت مظبوط ہو جاتی ہے۔مسلمانوں کی عظیم فتوحات ان دونوں کے حسین امتزاج کا نتیجہ تھیں۔یہی وجہ ہے کہ قبائل بادیہ جو کھلے صحراؤں میں موسموں کی سختیوں اور دشمنوں کے حملوں سے نبرد آزما ہوتے تھے، ان میں یہ عصبیت بہت مضبوط ہوتی تھی۔

انسان کی طبعی اور جسمانی صلاحیتوں کا دارومدار بہت حد تک اس کے جغرافیائی حالات

پر بھی ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے اس حوالے سے خطۂ ارضی کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا اور ساتواں غیر معتدل اور غیر آباد ہیں۔ باقی حصوں پر بھی انسانی آبادی ناممکن ہے، تاہم صحیح معنوں میں چوتھا حصہ معتدل ہے جہاں انسانی آبادی علم وفن، صنعت اور تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انبیاء کی اکثریت اسی حصہ ارضی میں مبعوث ہوئی۔

ابن خلدون کے بقول سیاست وتمدن کے ایک دوسرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس ریاست کی حکومت اچھی ہوگی وہ عروج کی طرف سفر کرے گی۔ سیاسی تنزل سماجی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ایک اچھی حکومت کا قیام واجب اور لازمی ہے۔ ایک عادل حکومت جو رعایا کی محافظ ہو ریاست وحکومت کو مثالی دور میں داخل کر دیتی ہے۔ طبعی وروحانی خوشحالی ایسے معاشرے کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ (۵۵)

ابن خلدون نے انسانی حکومت کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے بقول ایک حکومت انسان کے اپنے تخلیق کردہ مسلمہ اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ 'سیاست عقلی' کہلاتی ہے۔ اسے طبعی حکومت یا ملوکیت کہتے ہیں۔

اس کی بہتری کا دارومدار بادشاہ کی شخصیت پر ہے۔ اگر وہ رحم دل، باصلاحیت اور عادل ہو تو ریاست ترقی کرتی ہے اگر وہ ظالم اور اجڈ یا نالائق ہو تنزل کو کوئی نہیں روک سکتا۔

آپ کے خیال میں مثالی حکومت 'سیاست دینی' کے بناد پر معرض وجود میں آتی ہے جسے خلافت کہا جاتا ہے۔ اس کا سربراہ خلیفہ ہوتا ہے جو نبی کا جانشیں ہوتا ہے۔ (جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے وضاحت فرمائی تھی کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں، خلیفۃ الرسول ﷺ ہوں)۔

وجوب خلافت ابن خلدون کے بقول امت مسلمہ پر لازم ہے۔ یہاں تک کہ آنحضور ﷺ کی تجہیز وتکفین پر صحابہ کرام نے ترجیح دی اور حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر بیعت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تدفین عمل میں آئی۔ خلافت صرف ذریعہ بہتری نہیں بلکہ مقصود بالذات بھی ہے کیونکہ یہ قیام عدالت اور نفاذ احکام شرعیہ کی بنیاد بنتی ہے۔

ابن خلدون کے خیال میں عوام کو خلیفہ کے انتخاب میں رائے دینے کا حق نہیں، صرف ارباب حل وعقد اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ عوام پر خلیفہ کی اطاعت فرض ہے، انہیں اس کے تقرر سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ ابن خلدون نے خلیفہ کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا حق بھی دیا ہے۔

آپ نے خلیفہ کے اوصاف پر زور دیا ہے، جس کا مقصد ایک اعلیٰ صفت حکومت کا قیام ہے۔(۵۶)

ابن خلدون نے خلیفہ کے لئے درج ذیل اوصاف وشرائط ضروری قرار دیئے ہیں:

علم۔عدالت۔کفایت۔اعضاء وحواس کی سلامتی۔اور قریشی النسب ہونا، جس کی بنیاد حدیث نبوی ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ عربی معاشرے کا بہترین کنٹرول قریشی قبیلے کے کسی قابل فرد سے ہی ممکن تھا۔ یہاں کفایت سے مراد جہاں بانی کی خصوصیات کا بدرجہ اتم موجود ہونا ہے۔

علامہ ابن خلدون نے صوبائی خود مختاری کی بھی حمایت کی ہے۔آپ کے خیال میں جب ریاست بڑی ہو جائے اور حکومت کمزور ہو تو قیام امن مشکل ہو جاتا ہے۔"تنزل" کا آغاز ہو جاتا ہے۔ایسی صورتحال میں اگر کوئی صوبہ مرکز سے رابطہ رکھ کر خود مختاری حاصل کر لے یا اپنی مدافعت کے لئے علیحدہ خلافت در یاست قائم کر لے تو یہ عین فطری ہے اور ایسا کرنا انسانی ترقی اور بہتر نظم ونسق کے لئے ضروری ہے۔

آپ کے خیال میں خلافت ایسی صورت میں قائم رہتی ہے جب تک لوگ روحانی اور اخلاقی طور پر مضبوط رہیں۔اگر روحانی تنزل واقع ہو تو انسانوں کی فطرت سادہ عود کر آتی ہے اور معاشرہ بدامنی کا شکار ہو جاتا ہے، جس کے لئے مطلق العنان بادشاہت کی ضرورت پڑ جاتی ہے تا کہ امن و امان قائم ہو سکے۔ظلم کسی صورت میں قابل برداشت نہیں، یہ عمرانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔اس لئے عدل ضروری ہے۔(۵۷)

ہر قوم اپنی سیاسی تاریخ کے چار مراحل سے ضرور گزرتی ہے۔پہلی پشت میں بدویانہ خصوصیات زور پر ہوتی ہیں یعنی عصبیت کا غلبہ ہوتا ہے، جفاکشی اور محنت ہوتی ہے، حکومت مشاورت سے چلائی جاتی ہے۔گویا جدید زبان میں اسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔دوسری نسل میں حالات بدل جاتے ہیں۔حضری طریقہ زندگی پروان چڑھتا ہے اور عصبیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ تیسری پشت آرام کوشی کی بنیاد پر سہل پسندی کے ذریعے عصبیت ختم کر بیٹھتی ہے جس کے نتیجے میں چوتھی پشت میں قوم مغلوب ہو جاتی ہے۔۔۔۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حکومتی سطح پر ریاست پانچ مدارج سے گزرتی ہے۔پہلا دور طاقت اور فتح ونصرت یا غلبے کا ہوتا ہے۔دوسرا قوت بڑھنے کے بعد خود مختاری شروع ہو جاتی ہے

اور مشورہ کم پڑ جاتا ہے۔ جمہوری عناصر دم توڑتے ہیں اور شخصی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ دور ثالث میں حکومت تعیش میں پڑ جاتی ہے، صرف رعب داب اور شان وشوکت سے کام چلایا جاتا ہے۔ چوتھے دور میں بادشاہ پرستی چھا جاتی ہے۔ وہ صرف گذشتہ کامیابیوں پر قناعت کر کے پرسکون رہتا ہے۔ پانچویں دور میں حکومت چاپلوس اور خوشامدی لوگوں کے ٹولہ کے رحم وکرم پر ہوتی ہے جن کی سازشوں سے حکومت کو دیمک لگ جاتی ہے اور آخر کار کسی اور قوم کی عصبیت کے غالب آنے پر یہ سلطنت مغلوب ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون نے ریاست وحکومت کے معاشی نظام پر بھی کھل کر بات کی ہے۔ انہوں نے کسب معاش کے سلسلہ میں سب سے اہم زراعت کو، دوسرا بڑا ذریعہ تجارت اور تیسرا صنعت و حرفہ کو گردانا ہے۔ انہوں نے بادشاہ اور مملکت کو کرہ ارض کے سب سے بڑے بازار (مارکیٹ) قرار دیا ہے۔

ان کے بقول ریاست کی معیشت کا انحصار انہی پر ہے۔ بادشاہ کی بخیلی اور سخاوت و دریا دلی کا رعایا کی معاشی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ سلطنت کی طرف سے دولت کی گردش، ٹیکسوں کی وصولی کا نظام اور عطائے وظائف وغیرہ کے سلسلے معاشرے کو خوشحالی کی راہ پر گامزن کرتے ہیں بصورت دیگر معاشی تنگی مقدر ٹھہرتی ہے جو آخر کار جرائم اور بدامنی عام ہو جانے کا باعث بن جاتی ہے۔(۵۸)

ابن خلدون نے انسانی سیاست وسماج کے عمرانی پہلوؤں کا مطالعہ بڑے مرتب اور واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ کسی قوم اور ریاست کی طبیعی عمر اور مدارج کا یہ فلسفہ ابن خلدون کے گہرے تجربے اور عمیق تاریخی مطالعہ کا نتیجہ ہے جو ہر دور میں درست ثابت ہوتا رہتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ابونصر فارابی، آراء اھل المدینۃ الفاضلۃ: ۹۷
۳،۲۔ایضاً
۴۔ایضاً: ۱۱۰،
۵۔ایضاً: ۱۱۲
۶۔ایضاً: ۱۰۵۔۱۰۸
۷۔ایضاً: ۹۹
۸۔البقرۃ: ۴۷

9- Rosenthal, *Politicl Thought in Medieval Islam*
(Cambridge University Press -1958), p:26

۱۰۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ: ۵، ۱۱۔ایضاً، ۱۲۔ایضاً: ۶،
۱۳۔ایضاً، ۱۴۔ایضاً، ۱۵۔ایضاً: ۱۵۔۱۶، ۱۶۔ایضاً: ۲۳،
۱۷۔ایضاً: ۲۵۸، ۱۸۔ایضاً: ۲۴۰، ۱۹،۲۰۔ایضاً: ۲۴۱
۲۱۔نظام الملک طوسی، سیر الملوک: ۵، ۲۲۔ایضاً: ۸، ۲۳۔ایضاً: ۸۴،
۲۴۔ایضاً: ۷، ۲۵۔ایضاً: ۹۲۔۹۳، ۲۶۔ایضاً: ۸۷، ۲۷: ایضاً: ۶۸،
۲۸۔ایضاً: ۱۶،۱۶۳، ۲۹۔دستور الوزراء: ۳۶
۳۰۔ابوحامد محمد الغزالی، احیاء علوم الدین: ۲۰،
۳۱۔ایضاً، ۳۲۔ایضاً، ۳۳۔ایضاً: ۱۰۵، ۳۴۔ایضاً
۳۵۔الغزالی، نصیحۃ الملوک: ۱۸،۱۹،۲۴،۴۰،۴۱

۳۶۔ ایضاً :۹۴، ۳۷۔ ایضاً:۲،۱۳۴،۱۱۳۴۔۱۴۰ ۳۸۔ ایضاً:۱۲۹۔۱۶۲

39-Rosenthal, *Politicl Thought in Medieval Islam*, p:26

۴۰۔ الغزالی، احیاء علوم الدین:۳۰۲/۲، ۴۱۔ ایضاً :۳۰۸، ۴۲:ایضاً:۳۱۱، ۴۳۔ ایضاً:۳۳۷

۴۴۔ ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیۃ :۵۱، ۴۵۔ ایضاً:۶۵۔۶۸، ۴۶۔ ایضاً:۱۶۹، ۴۷۔ ایضاً:۱۷۰،

۴۸۔ منہاج السنہ:۳۵۴/۱، ۴۹۔ ایضا، ۵۰۔ ایضا، ۵۱۔ ایضا، ۵۲۔ ایضا، ۵۳۔ ایضا

۵۴۔ المقدمہ (منشورات، بیروت، س ن م) :۴۱،۴۲،۱۲۷،۱۳۱۔۱۳۴

۵۵۔ ایضاً:۵۲،۸۶،۹۱ ۵۶۔ ایضاً:۱۹۰،۱۹۱،

۵۷۔ ایضاً:۱۹۴، ۵۸۔ ایضاً:۳۸۸،۹۹۰،۳۹۵،۳۹۸

مراجع ومصادر

لغات

- ابن منظور، لسان العرب (بیروت ـ ۱۹۸۸ء)
- راغب اصفہانی، مفردات القرآن (مصر ـ ۱۳۰۴ھ)
- البستانی، محیط المحیط (بیروت ـ ۱۹۷۰ء): ۳۵۸،
- روحی بعلبکی، المورد (بیروت)
- فیروزآبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط (مصطفیٰ البابی، مصر ـ ۱۹۵۲ء)
- لوئس معلوف، المنجد (بیروت ـ ۱۹۵۱ء)
- مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس (دار الفکر، بیروت ـ ۱۹۹۴ء)

تفاسیر

- آلوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی (دار الفکر، بیروت ـ ۱۹۹۷ء)
- ابن الجوزی، عبدالرحمٰن، زاد المسیر (مکتب الاسلامی، بیروت ـ ۱۹۶۴ء)
- ابن العربی، محمد بن عبداللہ، احکام القرآن (دار المعرفت، بیروت ـ ۱۹۵۸ء)
- ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن (اسلامی اکادمی لاہور ـ ۱۹۷۶ء)
- جصاص، ابوبکر، احکام القرآن (المطبعۃ البہیہ المصریہ ـ ۱۳۴۷ھ)
- دریابادی، عبدالماجد، ترجمۃ القرآن (تاج کمپنی، کراچی ـ ۱۹۵۲ء)
- الرازی، فخر الدین، تفسیر الکبیر (دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۰ء)
- الزمخشری، محمود بن عمر، الکشاف (مطبعۃ الاستقامۃ، مصر ـ ۱۹۴۶ء)
- سید رشید رضا، المنار (دار المنار، مصر ـ ۱۳۶۶ھ)
- سید قطب، فی ظلال القرآن (دار الاحیاء الکتب العربیہ، مصر)

- سید مودودی، تفہیم القرآن (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔۱۹۹۱)
- مفتی شفیع، محمد، معارف القرآن (ادارۃ المعارف، کراچی۔۱۹۸۸ء)
- الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر (مصطفیٰ البابی مصر۔۱۳۴۹ھ)
- الطبری، محمد ابن جریر، جامع البیان (مصطفیٰ البابی، مصر۔۱۹۶۷ء)
- الطنطاوی، تفسیر الجواہر (مصطفیٰ البابی، مصر۔۱۳۵۰ھ)
- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن (دارالکتب العربیہ، مصر۔۱۹۶۷ء)

حدیث وسیرۃ

- ابن حجر، فتح الباری (مصر۔۱۹۵۹ء)
- ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (مصطفیٰ البابی، مصر۔۱۹۳۶ء)
- ابوداؤد، سنن ابوداؤد (بیروت۔۱۹۸۱ء)
- احمد بن حنبل، مسند احمد (دارالاحیاء التراث العربی، بیروت۔۱۹۹۱ء)
- بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری (دارالسلام، ریاض۔۱۹۹۷ء)
- ترمذی، جامع ترمذی (دارالفکر، بیروت۔۱۹۸۱ء)
- حمیداللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی (دارالاشاعت، کراچی۔۱۹۸۷ء)
- عہد نبوی میں نظام حکمرانی (اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی۔۱۹۸۷ء)
- محمد حمیداللہ، عہد نبوی کے میدان جنگ (مکتبہ عثمانیہ)
- شبلی رسلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ (لاہور۔۱۹۹۱ء)
- الکتانی، نظام الحکومۃ النبویۃ
- مبارکپوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم (لاہور۔۱۹۹۵ء)
- مسلم، ابن الحجاج، صحیح مسلم (بیروت۔۱۹۸۱ء)

تاریخ وسیاسیات

- ابن اثیر، الکامل (دمشق۔۱۳۵۶ھ)

* اسد الغابۃ (مکتبۃ الاسلامیہ، طہران): ۴ر۷ ،
* ابن تیمیہ، السیاست الشرعیہ (دار الدعوۃ الاسلامیۃ، لاہور)
منھاج السنہ (مکتبہ خیاط، لبنان۔۱۹۶۲ء)
* ابن حجر، العسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (مطبعہ مصطفیٰ محمد، مصر)
* ابن خلدون، مقدمہ (منشورات، بیروت)
* ابن خلکان، وفیات الاعیان (مکتبۃ النھضۃ المصریہ، قاہرہ۔۱۹۴۸ء)
* ابن رشد، بدایۃ المجتہد (مصر۔۱۳۳۹ھ)
* ابن سعد، طبقات (دار الفکر، بیروت۔۱۹۹۴ء)
* ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ (منشورات الشریف الرضی، ایران۔۱۹۶۹ء)
* ابو عبید، کتاب الاموال (مصر۔۱۹۸۱): ۹۷۔۱۹۳
* ابو یوسف، کتاب الخراج (بیروت۔۱۹۷۹ء)
* اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست (انجمن خدام القرآن، لاہور۔۱۹۷۷ء)
* بائیبل (اردو بائیبل سوسائٹی، لاہور۔۱۹۹۰ء)
* البلاذری، فتوح البلدان (نفیس اکیڈمی۔کراچی، ۱۹۸۶ء)
* انساب الاشراف (دار المعارف، مصر)
* جمیل احمد، انبیائے قرآن (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور)
* حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت (دہلی۔۱۹۵۶ء)
* حسن ابراہیم، النظم الاسلامیہ (بیروت۔۱۹۶۴ء)
* حمید اللہ، خطبات بہاولپور (اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔۱۴۰۱ھ)
* رزاقی، شاہد حسین، تاریخ جمہوریت (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔۱۹۵۷ء)
* سید محمد سلیم، آغاز اسلام میں مسلمانوں کا نظام تعلیم (ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور)
* سرخسی، المبسوط (بیروت۔۱۹۸۹ء)
* سید سلیمان ندویؒ، ارض القرآن (معارف پریس اعظم گڑھ۔۱۹۵۶ء)
* سید رشید رضا، الخلافۃ (مصر ۱۳۴۱ھ)

- شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء (لاہور۔۱۹۷۶ء)
- طنطاوی، عمر بن خطاب (مصطفی البابی، مصر۔۱۳۵۲ھ)
- طوسی، نظام الملک، سیر الملوک (پیرس ۱۸۹۰ء)
- دستور العلماء (پیرس ۱۸۹۰ء)
- عبدالرؤف ملک، مغرب کے عظیم فلسفی (ادارہ ادبیات نو، لاہور۔۱۹۶۴ء)
- عمری، جلال الدین، عورت اسلامی معاشرہ میں (مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۸۳ء)
- الغزالی، احیاء علوم الدین (مصطفی البابی، مصر۔۱۹۳۹ء)
نصیحۃ الملوک (کتاب خانہ طہران ۱۳۵۷ء)
- الفارابی، ابونصر، آراء اھل المدینۃ الفاضلۃ (بیروت ۱۹۵۹ء)
- گوہر الرحمٰن، اسلامی سیاست (المنار، لاہور۔۱۹۹۵ء)
- الماوردی، الاحکام السلطانیہ (مصر۔۱۹۶۰ء)
- المسعودی، التنبیہ والاشراف (بیروت۔۱۹۶۵ء)
مروج الذھب (مصر۔۱۳۴۶ھ)
- مرتضٰی احمد خاں، تاریخ اقوام عالم (تاج کمپنی، لاہور۔۱۹۵۰ء)
- سید مودودی، الجہاد فی الاسلام (ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۹۵ء)
- خلافت وملوکیت (لاہور۔۱۹۸۸ء)
- ناسک، صلاح الدین، افکار سیاسی۔مشرق ومغرب (عزیز پبلشرز، لاہور۔۱۹۷۷ء)
- یعقوبی، کتاب البلدان (بیروت۔۱۹۶۰ء)
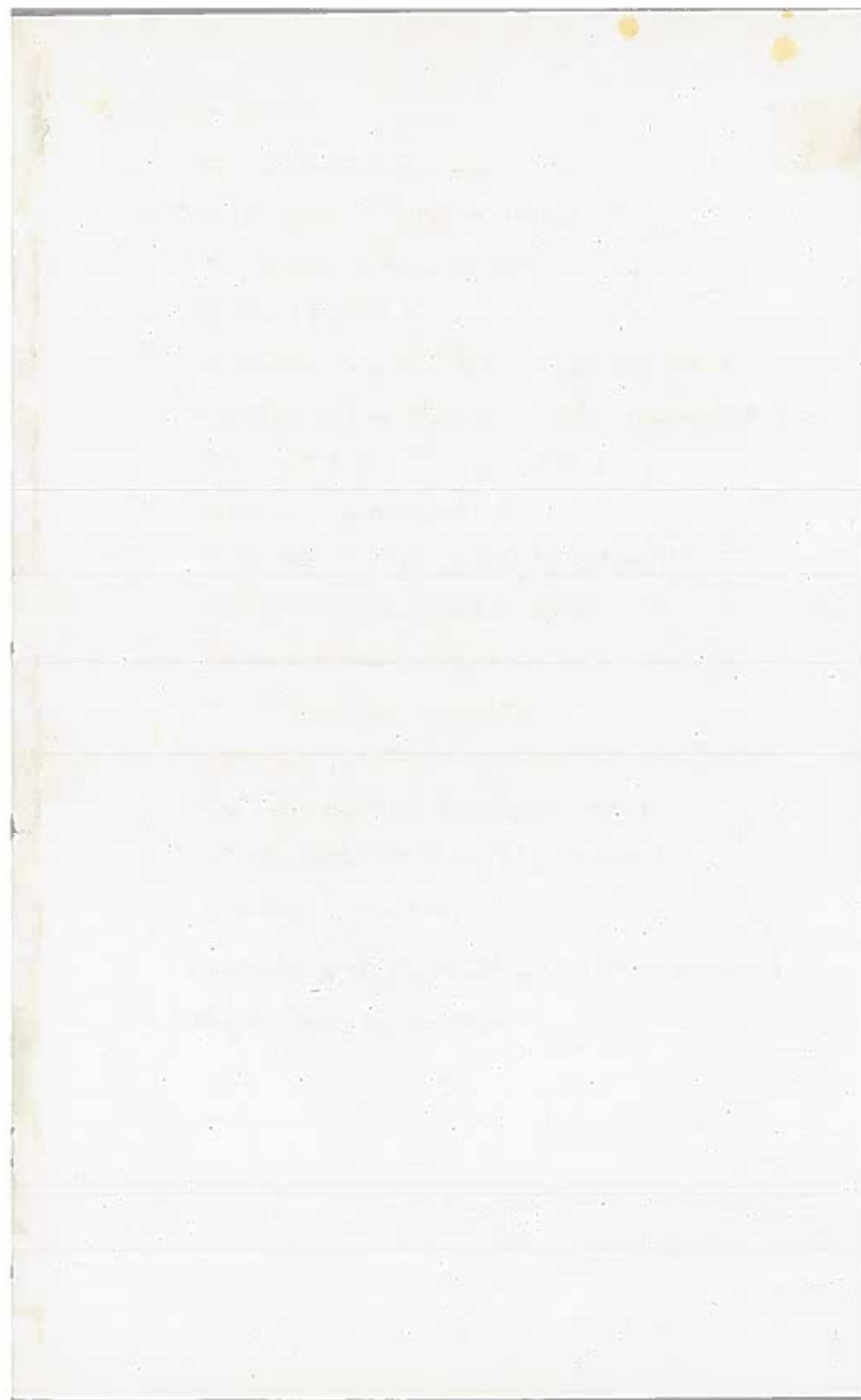
نبی آخر الزماں ﷺ نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں، مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کی، قرآن مجید کی ہدایات کی روشنی میں، آپکی دس سال کی کاوش کے نتیجے میں، یہ ریاست تقریباً ۱۵ لاکھ مربع کلومیٹر کی وسعت اختیار کر گئی۔ آنحضور ﷺ کے بعد آپ کی براہ راست تربیت سے فیضیاب، صحابہ کرامؓ نے قرآن وسنت کے ہدایت کردہ طریق کار کے مطابق، خلافت راشدہ کی صورت میں، اسلامی ریاست کا نظم ونسق، جاری وساری رکھا۔ اسلامی ریاست کا یہ مثالی دور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ تاریخ عالم میں، ایک سنہرے باب کے طور پر ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی نے اس کتاب میں اسلامی ریاست کے اسی عہد زریں کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے، جس سے ریاست وحکومت کے اسلامی اصول مرتب اور منظم انداز میں سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب میں، تاریخی نظائر کی روشنی میں، اسلامی سیاسیات کے بنیادی اصولوں پر بحث، عصر حاضر کے تناظر میں کی گئی ہے۔

ڈاکٹر علوی کے مطالعہ کا میدان سیاسی وسماجی فکر وفلسفہ ہے، خاص طور سے وہ جدید فکر کا تجزیہ اسلامی تناظر میں پیش کرنے میں، معروف ہیں۔ آپ، گذشتہ بیس سال سے ملک کی معروف جامعات میں تحقیقی اور تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آجکل اسلام آباد کی جامعہ خواتین وش سے وابستہ ہیں اور نمل یونیورسٹی اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں بطور وزیٹنگ پروفیسر پڑھاتے ہیں۔